حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی و ادبی ماہ نامہ

سب رس

جنوری 2018ء
30/- روپے
ISSN 2278 6902

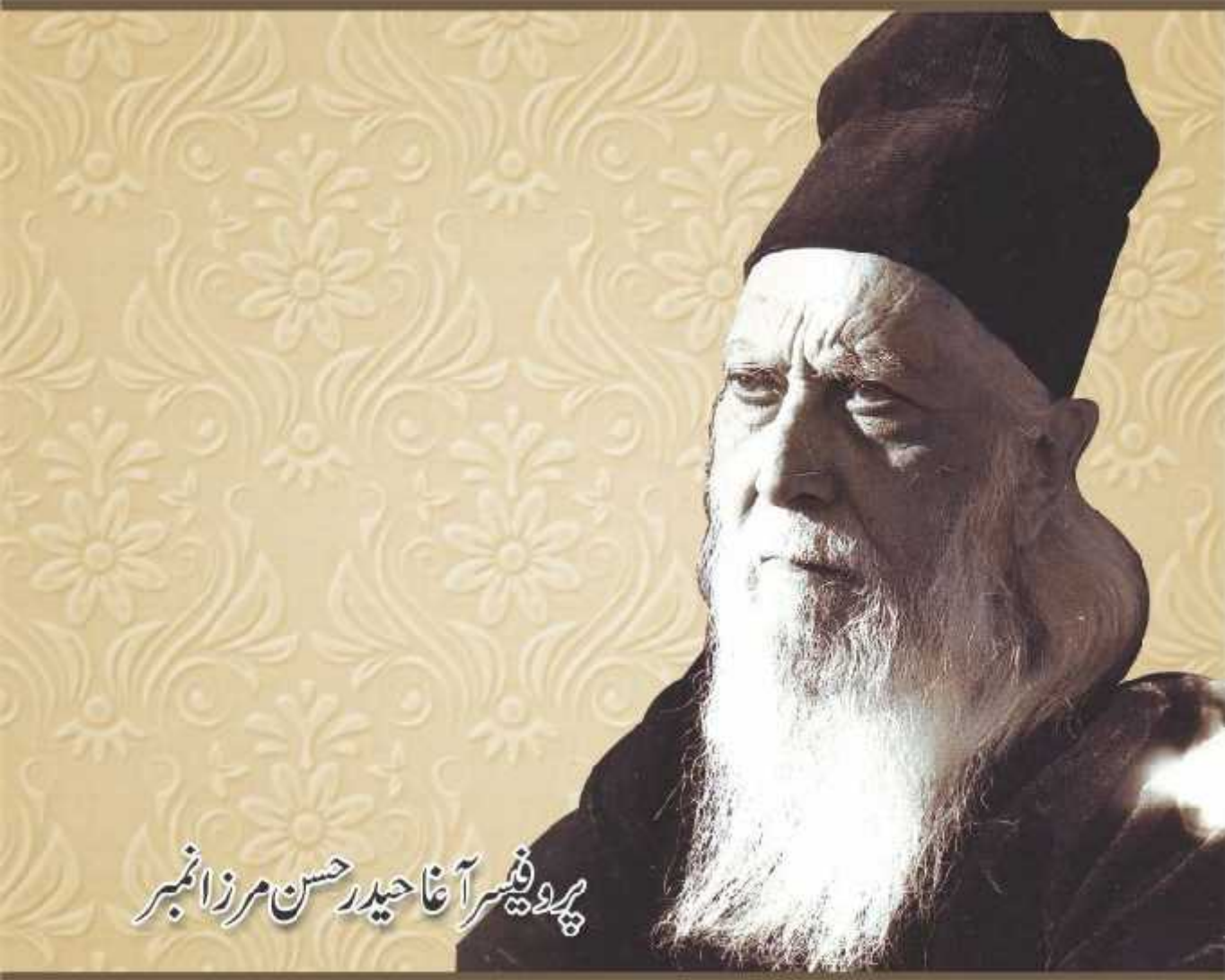

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا نمبر

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا اور ان کی بیگم سیدہ بدر النساء بیگم

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا، شریمتی اندرا گاندھی، اور
انتر آراء بیگم ہمشیرہ جناب فخر الدین علی احمد، سابق صدر جمہوریہ ہند

آغا حیدر حسین مرزا نظام کالج کے ساتھیوں کے ساتھ

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ | شمارہ: ۱ | ماہ: جنوری | سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

زرِ سالانہ

قیمت: 30/-

❁ ہندوستان: **300روپے**

❁ کتب خانوں سے: **400روپے**

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600روپے

❁ مغربی وعرب ممالک سے 60ڈالر یا 40پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد .082 500 انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طٰہٰ پرنٹ سسٹمس بلکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کررہی ہیں۔
آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔
آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
مند پسند اور
آزمودہ نسخہ

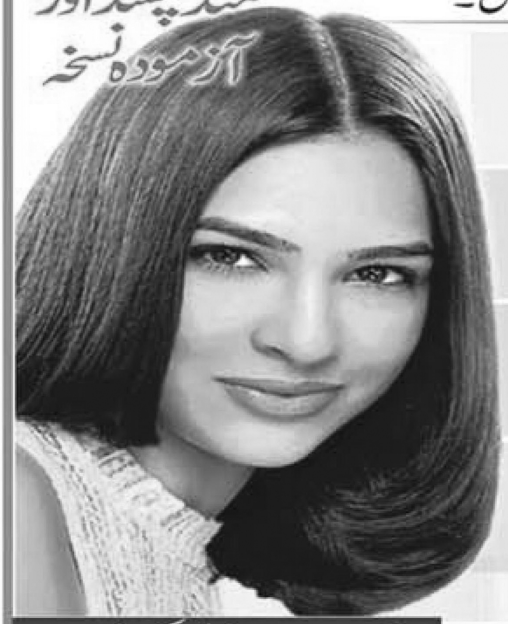

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفادور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
• چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
• جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
• چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاؤڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑا، منہ سے بدبو آنا وغیرہ، میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

• کلونجی تیل • کلونجی مساج آئیل • کلونجی پین بام • سفوف ظہیر • اکسیر معدہ
• سفوف اپسرا • سفوف دمہ • کلونجی شوگر پاؤڈر • کلونجی چیون پراش
• اکسیر جگر • معجون کلونجی • کلونجی شیمپو پاؤڈر • مرہم کافوری • روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان
جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

Mfg. Lic. No. 327/DU/98

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال، دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ہے

اس شمارے میں

اداریہ

آغا حیدر حسن مرزا	بیگ احساس	6

مضامین

میرے والد محترم کے ساتھ بتائے گئے کچھ خوشگوار لمحات کا ذکر	مہر النساء بیگم	8
آغا چچا چند باتیں چند یادیں	راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیرا/اشرف رفیع	16
چند یادیں	فاطمہ عالم علی	18
دکنی ادب اور آغا حیدر حسن	اشرف رفیع	22
آغا حیدر حسن مرزا کی برجستہ گوئی	شاہد حسین زبیری	30
پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا.....مایہ ناز شخصیت	نسیمہ تراب الحسن	33
آغا صاحب باغ و بہار شخصیت	آمنہ انصاری	36
گھر سے کالج تک	طیبہ بیگم بلگرامی	38

آغا حیدر حسن مرزا کی تحریریں

دادا حسینی	آغا حیدر حسن مرزا	40
اردو محاورے	آغا حیدر حسن مرزا	43
کتّے کی کہانی	آغا حیدر حسن مرزا	46
سرون فرینجن	آغا حیدر حسن مرزا	54
وقار النساء بیگم کی کتاب پکوان کا دیباچہ	آغا حیدر حسن مرزا	61

تنقیدی مضامین

آغا حیدر حسن اور موسیقی	حبیب نثار	65
خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا	شاہد حسین زبیری	69
آغا حیدر حسن کی بیگماتی زبان کی لطافت	فریدہ تبسم	72
آغا حیدر حسن اور خطاطی کا فن	عبدالغفار	78

اداریہ

آغا حیدر حسن مرزا ان شخصیتوں میں سے تھے جن کے بارے میں میرؔ نے کہا تھا

مت سہل ہمیں جانوں پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

دلّی کے لٹ جانے کے بعد وہ علی گڑھ گئے اور ۱۹۳۰ء کے آس پاس وہ علی گڑھ سے حیدرآباد منتقل ہوئے۔ حیدرآباد انھیں راس آیا۔ مرتے دم تک وہ یہیں رہے 5/نومبر 1976ء کو ان کا انتقال ہوا۔ آغا صاحب کی تدفین خطّہ صالحین، نامپلی، حیدرآباد میں ہوئی۔

آغا صاحب کی صاحب زادی مہر النساء بیگم اور داماد میر معظم حسین نے جس طرح لندن اور یوروپی ممالک میں بڑے شاعروں اور ادیبوں کے مکانات کو میوزیم میں تبدیل کر دیا جاتا ہے انھیں خطوط پر آغا صاحب کے مکان حیدر منزل کو ایک میوزیم کی شکل دی۔ اس میوزیم کو کتب خانہ، نوادرات، قلمی تحریروں اور تصویروں، مشاہیر کے خطوط، آغا صاحب کے لکھے ہوئے مضامین، تصاویر، مسودے ان کے استعمال کی اشیاء سے آراستہ کیا گیا۔ دونوں نے آغا صاحب کی بکھری ہوئی تحریروں کو بھی کتابی شکل شائع کیا۔

محترمہ رانی اندرا دیوی دھن راج گیر اور نواب اصغر حسین خاں تیمور کی خواہش پر ''سب رس' کا یہ خصوصی شمارہ ترتیب دیا گیا۔ ہمارا مقصد ہے کہ آغا صاحب کے کارنامے نئی نسل تک پہنچیں۔ قند مکرر کے طور پر کچھ پرانی تحریریں شامل کی گئیں۔ نئے مضمون بھی لکھوا گئے۔ جن لوگوں نے آغا صاحب کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ان کے تاثراتی مضامین بھی جمع کیے گئے۔ آغا صاحب کے کارناموں کو سمیٹنے کے لیے ہزاروں صفحات درکار ہیں۔ ہم نے دریاء کو کوزے میں بند کرنے کی کوشش کی ہے۔ ایسا مواد فراہم کر دیا جس سے آغا صاحب کی شخصیت اور فن کا ایک خاکہ ابھرتا ہے۔ ان کے متعلق مزید جاننے کی ایک خواہش ابھرتی ہے۔ جو لوگ آغا صاحب کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش رکھتے ہیں وہ ان کے ریسرچ سنٹر سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

آغا صاحب حیدرآباد کے لیے کسی نعمت مترقبہ سے کم نہ تھے میر معظم حسین نے آغا صاحب کا سراپا کس عمدگی سے کھینچا ہے۔

''آغا صاحب کا قد درمیانہ، قدرے جھکے ہوئے چوڑے شانے، سنہری لانبے بال، بغیر پھندنے کی ٹوپی کے نیچے جمے ہوئے ہوتے۔ سبزی مائل بھوری آنکھیں، یونانی ستوان ناک، دور دراز مخلوط شادیوں کے باوجود گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں مغل خون کی غمازی کرتی تھیں۔ صاف ستھری ٹھڈی، گلابی رنگت، مخروطی انگلیوں میں ہیرے اور یاقوت سے جڑی انگوٹھیاں جو کہ صلابت جاہ کا

تحفہ تھا جن کو اپنے والد میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس سے ملا تھا۔ شیروانی میں نیم قیمتی پتھروں والے بٹن کالر تک لگے ہوئے بٹی ہوئی پنڈلیوں پر چست ریشمی پاجامہ، سنہری دھاگوں والا پشاوری سینڈل یہ مکمل حلیہ آغا صاحب کا تھا''۔

آغا صاحب ایک طرف تو مشاق داستاں گو، بیگمات کی زبان کے ماہر، ادب تاریخ، مذہب، فلسفہ، ادبی تنقید، مرقع نگاری، خاکہ نگاری، ڈراما نگاری، انشائیہ نگاری، تحقیق اور بچوں کے ادب پر عبور رکھتے تھے۔ وہ چلتے پھرتے انسائیکلو پیڈیا تھے۔ دوسری طرف وہ حکیم اجمل خاں اور مہاتما گاندھی کے ساتھ تحریک خلافت میں بھی شامل رہے۔ وہ قدیم وجدید کا عجیب امتزاج تھے۔ آغا صاحب کی آنکھوں نے بہت کچھ دیکھا۔ انھوں نے ہندوستان بھی دیکھا اور مغربی ممالک بھی!! آغا صاحب کے پردادا نواب احمد شکوہ شاہ عالم ثانی شہنشاہ مرزا عبداللہ گوہر کے فرزند تھے۔ آغا حیدر حسن مرزا کے دادا آغا حسن جان تھے جنھوں نے سب سے پہلے انگریزی پڑھی اور انگریزی کتابیں لکھیں۔ انگریز نوازی کی وجہ سے وہ شہر میں بدنام تھے۔ دادی حیدری بیگم جو آغا حسن خاں کی آٹھویں بیوی تھیں ان کا نسب ساتویں پشت میں اورنگ زیب عالم گیر کی صاحب زادی زینت النساء سے ملتا تھا۔ آغا حسن جان اور حیدری بیگم سے آغا صفدر حسن پیدا ہوئے جو آغا حیدر حسن مرزا کے والد تھے۔ اس طرح آغا صاحب کا سلسلہ نسب مغل خاندان سے ملتا ہے۔ آغا صاحب کا پہلا مدرسہ ان کا گھر تھا۔ ان ہی کے گھر سے ان کی نسوانی زبان پروان چڑھی۔ غدر ہوا تو مسلم خواتین نے ان کے گھر میں پناہ لی تقریباً 30، 40 شہزادیاں ان کے مکان میں مقیم تھیں۔ آغا صاحب نے آنکھ کھولی تو ان کے اطراف عورتیں ہی عورتیں تھیں اس طرح انھیں بیگماتی زبان پر عبور حاصل ہوا۔ ڈاکٹر یوسف حسین خاں لکھتے ہیں۔

> ''آغا صاحب کی گفتگو کا انداز مخصوص ہے۔ ان کی لچھے دار باتیں ان کا نرم و نازک لہجہ اور دلکش انداز بیان سننے والوں کو دہلی کی قدیم حویلیوں اور قلعہ معلیٰ کی صحبتوں میں پہنچا دیتا ہے، وہ ہر محفل میں طوطی ہزار داستان کی طرح چہکتے ہیں، حیدرآباد کے اعلیٰ طبقہ میں بہت مقبول ہیں۔ اور ان لوگوں میں ان کی بڑی مانگ ہے لوگ انہیں پکڑ لے جاتے ہیں اور دنوں مہمان رکھتے ہیں صرف ان کی باتوں سے محضوظ ہونے کے لیے''

ہم نے کوشش کی ہے کہ آغا صاحب کے تمام رنگ یکجا ہو جائیں۔ آپ کو یہ شمارہ کیسا لگا۔ اپنی رائے سے نوازیں۔

بزم صدف انٹرنیشنل کے زیر اہتمام دو روزہ بین الاقوامی ادبی و ثقافتی جشن، 29 اور 30 دسمبر کو پٹنہ، بہار میں منعقد کیا گیا۔ پدم شری مجتبیٰ حسین اور عشرت معین سیما کو بزم صدف بین الاقوامی ایوارڈ 2017ء سے نوازا گیا۔ پدم شری مجتبیٰ حسین کی ادبی خدمات پر دس مقالے پڑھے گئے پروفیسر بیگ احساس کے افسانوی مجموعے ''دَخمہ'' پر ساہتیہ اکادمی دلّی نے 2017ء کے ایوارڈ کا اعلان کیا۔ ایوارڈ کی تقریب 12 رفروری 2018ء دہلی میں منعقد ہوگی۔ جس میں ایک لاکھ روپے اور امتیازی نشان دیا جائے گا۔

قارئین ''سب رس'' کی خدمت میں نئے سال کی مبارک باد.....!

بیگ احساس

مضمون

مہر النساء بیگم

میرے والد محترم کے ساتھ بتائے گئے کچھ خوشگوار لمحات کا ذکر

میرے والد محترم آغا حیدر حسن مرزا مرحوم سابق پروفیسر نظام کالج کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ موصوف کے ادبی کارناموں سے سب ہی واقف ہیں۔ ان کی زبان دلی کی لال قلعہ کی ٹکسالی زبان تھی اور قلم پر قدرت رکھتے تھے جو کہ ادبی میدان میں اپنی نظیر آپ تھی۔ میری والدہ سیدہ بدرالنساء بیگم بھی میرے والد کی طرح قابل شخصیت تھی۔ میری والدہ علمی اور مہذب خاندان سے وابستہ تھیں۔ وہ محسن الملک اور ان کے چھوٹے بھائی میر حسن کی نواسی اور سردار میر عون علی کی صاحبزادی تھی۔ سردار عون علی ریاست گوالیار کے وزیر عدلیہ تھے۔ کم سنی میں میری والدہ کی ماں سیدہ مرتضی بیگم کا انتقال ہو گیا تھا۔ مہارانی چنکو سندھیا اور ان کے شوہر مادھو راؤ سندھیا نے انھیں اپنی بیٹی کی طرح پالا، مہارانی کے ہمارے پاس کئی خطوط اور تصویریں ہیں، جس میں میری والدہ کو بیٹی کہہ کر مخاطب کرتی تھیں۔ مہارانی کو مجھ پر خاص توجہ رہی ہے۔ وہ مجھے کرشنا کماری کہہ کر پکارتی تھیں۔ گنگا جمنا کی تہذیب کی حیثیت سے میں نے ان کے ساتھ بچپن میں ہندوستان کے کئی شہروں کا سفر کیا۔ مہارانی غیر معمولی شخصیت کی حامل تھیں اور مہاراجہ سندھیا کے انتقال کے بعد گوالیار کی ریجنسی کا مشکل کام بھی نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ میری والدہ کو ادب اور قاعدہ کا بے حد خیال تھا۔ وہ اردو، ہندی، مراٹھی اور انگریزی، فرنچ، سنسکرت اور فارسی زبانوں میں ماہر تھیں اور ریاست کے معمولات میں مہارانی کو مشورہ بھی دیا کرتی تھیں۔ جس طرح میں نے والد سے اردو سیکھی اسی طرح والدہ سے انگریزی کی ابتدائی تعلیم اور تہذیب کا درس پایا۔ مہارانی کے انتقال سے میری والدہ کو اس قدر صدمہ ہوا کہ وہ بیمار رہنے لگی۔ صحت کی خرابی کی وجہ سے ان کو علاج کے لئے بنگلور اور حیدرآباد کے دواخانوں میں شریک ہونا پڑا۔ 1940 میں مرض نے طول کھینچا اور وہ جانبر نہ ہوسکیں۔

محل میں بہت لاڈو پیار میں پلنے کے باوجود وہ بہت خوددار خاتون تھیں۔ ان کا شمار اس دور میں ترقی پسند خواتین میں ہوتا تھا۔ والدہ محترمہ نامپلی نسوان کالج میں انگریزی پڑھاتی تھی۔ میرے والد اور والدہ دونوں سررشتہ تعلیمات سے منسلک رہے۔ ہمارے گھر پر علمی ماحول کا اثر تھا۔ میری والدہ کی سروجنی نائیڈو، پدما جا نائیڈو اور اس زمانے کے کئی ترقی پسند خواتین کے ساتھ خط و کتابت ہوتی تھی، میں ان کی اولاد میں سب سے بڑی تھیں۔ مجھ کو بچپن ہی سے پڑھنے کی طرف راغب کرتے رہے۔ اردو تو مادری زبان تھی لیکن دوسری سہیلیوں اور بچوں سے بھی صیغہ تذکیر میں باتیں کرتی تھیں۔ جیسا کہ میں آیا، میں گیا وغیرہ۔ والد صاحب اس کی تدارک کی طرف متوجہ کرتے اور ن۔ق۔ک اور نہ کا استعمال سکھاتے تھے۔ لغت کا استعمال سکھاتے تا کہ زبان صاف ہو۔ میں اُن جملوں کو ابھی بھی گنگناتی ہوں چند یاد ہے مجھے، جیسے:۔

''قاضی جی قاضی جی خواجہ صاحب کے خاندان کا قصہ ختم کیجئے''

اس طرح سے وہ مجھے اردو سکھاتے تھے۔ غلط الفاظ جملے کو اسی وقت درس کرتے تھے اور ہنس کر کہتے تھے کہ تم تو اردو کو پنجابی بنادوگی۔ کالج سے واپس ہوکر اپنے پاس بٹھاتے پڑھاتے غزلیں اور نغمے گاتے اور اپنے ساتھ مجھے گواتے، غزلوں کے مطالعے سے دلچسپی ہونے کی وجہ سے مجھ میں اردو پڑھنے کا جذبہ مضبوط ہوا۔ محمد حسین آزاد کی آب حیات بچپن سے ہی پڑھنا شروع کروائیں۔ ایک نہایت ہی قابل پنڈت کو سنسکرت اور ہندی

پڑھانے کے لئے مقرر کیا۔ کئی سال کے بعد کم عمر میں سرکاری امتحان امتیازی کے ساتھ کامیاب کرنے کے بعد مجھے تمغے ملے۔

والد صاحب روزانہ کچھ نہ کچھ لکھواتے تھے تا کہ اردو ادب سے ذوق وشوق پیدا ہو۔ جسے میں نے زندگی بھر نہیں چھوڑا۔ میرے ہر خط کو والد صاحب سجا کر رکھتے تھے اور اپنے دوست واحباب کو مثال کے طور پر بتاتے کہ گھر کے ماحول سے ہی بچوں میں زبان کی محبت اور قدرتی جذبہ پیدا ہوتا ہے، ایسے ہی وہ اپنے خصوصاً خواتین شاگردوں کو لکھنے میں اسی طرح سے شوق بڑھاتے تھے، ان کے خاص شاگردوں میں زینت ساجدہ، آمنہ انصاری، بلراج سہانی، اشرف رفیع صاحبہ، محی الدین حسین یاد آتے ہیں اس کے علاوہ ہندوستان اور دیگر ملکوں کے کئی شاگرد جو اپنا نام اردو ادب میں روشن کئے۔

پنڈت نہرو اپنی بیٹی کو دنیا کی تاریخ کا درس جیل سے خطوط کے ذریعہ دیا کرتے تھے، تاریخ ہندوستان، تاریخ اسلام اور تاریخ یوروپ ویسے ہی والد صاحب نے قصوں اور کہانیوں کے ذریعہ مجھ کو سکھایا نصابی کتابوں کو پڑھنے کا وقت آیا تو تاریخی واقعات سمجھنے کا پہلا زینہ ثابت ہوئے۔ انہیں جلال الدین اکبر، مغل بادشاہوں کے علاوہ رامائن کی کتھا، گوتم بدھ، اوپنشد وغیرہ کے سیکڑوں قصے یاد تھے اور بڑے مزے سے سناتے تھے، بہت سے چٹکلے، بیربل کے ہوتے۔ ان کے ذریعہ فیضی اور ابوالفضل عربی وغیرہ سے ادبی روشنائی سی ہوئی، مثلاً ایک لطیفہ یاد آرہا ہے مجھے:

''آگرہ کے قریب ایک گاؤں میں دیہاتیوں نے سوچا کہ چلو بادشاہ کو ایک قصیدہ تیار کر کے دربار میں پیش کریں گے اور انعام واکرام سے فائز ہوں گے۔ مقامی شاعر نے قصیدہ تیار کیا۔ سوچا کہ بادشاہ کو تشبیہ دینے کے لئے گاؤں میں بڑی چیز تو گدھا ہے۔ چلو یہ شعر لکھ ڈالیں

التوا کی چوٹی پتلوا کی جڑ
اکبر بادشاہ بڑے گیدی کھر

راستے میں فیضی مل گئے پوچھا کہ کہاں جارہے ہو جواب دیا کہ بادشاہ کے لئے قصیدہ لکھ کر لائے ہیں۔ دربار جارہے ہیں فیضی نے کہا ذرا ہمیں بھی سناؤ۔ انھوں نے شعر سنایا۔ فیضی نے مشورہ دیا کہ گیدی کھر کو ''گوہرز'' سے بدل دو بادشاہ خوش ہوجائیں گے۔ اکبر گوہر کی ترکیب سن کر بھڑک گیا کہ دیہاتیوں نے یہ قافیہ کیسے لگایا۔ تعجب سے پوچھا کہ یہ شعر تم نے لکھا ہے۔ بیچارے دیہاتی ڈر گئے اور کہنے لگے کہ نہیں ان داتا ہم نے تو گیدی کھر کہا تھا لیکن اس نے (فیضی کی طرف اشارہ کر کے) ہمارے لکھے کو بدل دیا۔ اکبر نے ہنس کر کہا کہ میں تاڑ گیا تھا کہ تم بس ایسا ہی لکھ سکتے تھے۔ انعام دے کر رخصت کیا۔

والد صاحب مجھے پڑھاتے تو ادب ہو یا تاریخ یا کوئی اور مضمون، قصہ کہانیوں سے اس مضمون کی ابتداء کرتے۔ آہستہ آہستہ زیادہ مشکل حصہ کی صراحت کرتے جاتے۔ یہی طریقہ ان کے مذہبی حکایات اور دینیات سکھانے کا تھا۔ والد صاحب سے سنی ہوئی کہانیاں میں اپنے بچوں کو سنایا کرتی تھی۔ ان کی مشہور کہانی چڑیا چڑے کی کہانی کے متعلق آج بھی لوگ پوچھتے ہیں کہ ہمیں وہ کہانی کہاں مل سکتی ہے۔

تعلیمی مصروفیات کے باوجود والد صوم وصلوٰۃ کے سخت پابند تھے۔ اکثر تہجد بھی پڑھتے۔ عمر کے آخری حصہ میں شاید ہی کبھی ناغہ کی ہو۔ والد صاحب کی آواز میں طرز اور درد تھا۔ بغیر مطلب جانے بچپن میں ظفر، اقبال اور غالب و فانی کی غزلیں خوب گائیں۔ والد صاحب کی قرأت بھی صاف تھی، اکثر صبح میں نماز کے بعد انگیٹھی کے اطراف بیٹھ کر تلاوت کرتے اور مجھے بھی اپنی کشمیری شال میں لپیٹ لیتے میں بھی قرأت کی آواز سے بیدار ہوجاتی۔

میرے بعد ہماری ایک چھوٹی بہن بھی تھی وہ بھی کافی

ذہین تھیں اوران میں بھی یہی ذوق شوق تھے مگرافسوس کم عمری میں ہی وہ گذر گئیں۔ان کے انتقال سے والدین ہم سب غمگین رہتے۔ ان کے بعد میرے بھائی آغا سرتاج حسن مرزا پیدا ہوئے۔سرتاج مجھ سے چھ سال چھوٹے تھے۔ والد اور والدہ انہیں بھی توجہ سے پڑھاتے اور ہمیشہ کوشاں رہتے کہ تعلیم کے ساتھ اخلاق نیک خصائل اور خاندانی روایات کا حامل ہوں۔ میرے بھائی نے نظام کالج سے ایم اے کامیاب کیا اور بفضل تعالیٰ اخلاق علم اور بلند خیالی کے پیکر تھے۔

بچپن سے ہی ہم بھائی بہن ایک دوسرے پر فدا تھے۔ ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا کہ تمام افراد خاندان چچازاد، پھوپھی زاد بہن بھائی مل جل کر رہتے تھے۔ جب میرے تایا بے وقتی نوجوانی میں قتل کئے گئے۔ ان کے پورے بچے ہمارے گھر آ گئے اور ہمارے ساتھ بچپن گذارے۔اس کے علاوہ ہماری چھوٹی پھوپھو انجمن آراء بیگم اپنی اولاد، انور حسین اوران کی بہن شاہین سلطانہ بھی یہیں رہے۔ ہماری گھریلو زندگی میں والد اور والدہ نہایت ہی وسیع النظر تھے۔ رمضان ، عید محرم ، دیوالی، ہولی، کرسمس وغیرہ سب منایا جاتا تھا۔ ہر مذہب اور عقیدے کے لوگ اور دوست احباب کسی بھی وقت بغیر اطلاع ملنے آتے اور ان کا گرم جوشی سے استقبال ہوتا اور خاطر تواضع ہوتی۔ ایسا بھی ہوا کہ بعض دفعہ دونوں تھک کر باہر سے آتے پر دروازہ ہمیشہ مہمانوں کے لئے کھلا رہتا۔ کئی بار والد میری والدہ کی بیماری کے زمانے میں سکندرآباد کے اسپتال سے آ کر سو جاتے کوئی صاحب تشریف لاتے ، کبھی کوئی دوست ہوتے جو والد کو ساتھ بھجوا کر اپنے لئے کسی کام میں سفارش کروانا چاہتے۔

ایک دن پریشانی کے عالم میں تھکے ماندے آ کر سو گئے۔ ایک صاحب آئے اوران کو اپنے ساتھ لے جانا چاہا میں ناراض ہوئی اوران سے ذرا سخت لہجے میں کہا کہ وہ آج آپ سے نہیں مل سکتے۔کسی طرح والد صاحب میری آواز سن کر اٹھ بیٹھے۔ باہر نکل آئے۔آنے والے سے خندہ پیشانی سے ملے۔انھوں نے آنے کی غرض بتائی،تو فوراً شیروانی، سلیم شاہی جوتے پہنے،اوراپنی مخملی لوہارو ٹوپی اوڑھی ان کے ساتھ ہولئے۔ جانے سے پہلے مجھے علیحدہ بلا کر سمجھایا کہ 'بیٹی اللہ سے ڈرو، گھر پر کوئی آتا ہے تو اللہ کی بھیجی ہوئی نعمت سمجھو۔معلوم نہیں ہم پر کیسا وقت آئے۔ خدارا آئندہ کسی کو واپس کرنے کی کوشش نہ کرنا،ان کی مالی حیثیت صرف پروفیسر کی تھی مگر لوگ سمجھتے تھے کہ کوئی خزانہ ان کے پاس چھپا ہو۔ ہمیشہ مہمان نوازی میں کوئی کمی نہیں چھوڑتے تھے۔ایسی باتیں تھیں جن کی وجہ سے لوگ ان کے گرویدہ تھے۔اور آج بھی لوگ انہیں یاد کرتے ہیں۔

وہ کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتے تھے۔ ہمیشہ ان کی زبان پر یہ شعر رہتا ؎

''سر بایار دست با کار''

بیٹھے بیٹھے تخت پر بات کرتے ہوئے مختلف پتھروں کے دانے سے تسبیح بناتے اور اتنے تسبیح پُروئے کہ ان کی تسبیحوں کی شہرت ان کے شیروانیوں کے ساتھ مقابلہ کرتی تھیں۔

جہاں ہم رہتے تھے۔بنجارہ ہلز میں پہلے اطراف میں دور دور تک کوئی آبادی نہیں تھی۔بس ایک یا دو گھر تھے۔ والد صاحب گھر کے اطراف کئی پیڑ پودے لگائے۔انار اور آم، شہتوت، چیکو وغیرہ اور ہم بچوں کے نام پر ایک ایک آم اور انار کا درخت رکھے۔ ہم چھٹی کے دن ان درختوں کے نیچے بیٹھ کر پکنک منایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ تقریباً 40 قسم کے گلاب لگائے اور چنبیلی کی بیلیں بھی گلاب اور چنبیلی کی بھینی بھینی خوشبو دھپکالے میں پورے گھر کو مہکاتی تھی۔ہمارے گھر کے سامنے ایک تالاب تھا جس میں وہ کنول کے پھولوں کی بیلیں، پودے۔کئی خواتین آتیں والد صاحب سے اجازت لے کر پھول توڑ کر اپنے بالوں میں سجاتی یا مندر پر

چڑھاوے کے لئے لے جاتیں۔

صبح فجر کے بعد پودوں کو پانی دے کر فارغ ہوکر والد صاحب کبوتروں اور فاقتوں کو دانا دیتے تھے۔تقریباً500 کبوتر کو پالے تھے۔ والد کی ایک آواز پر کبوتر اڑ کر آجاتے۔ایسا معلوم ہوتا جب کبوتر اڑ کر ایک جھنڈ میں گھل مل کر آتے تو کوئی گہرا بادل آسمان پر چھا گیا ہو۔اور بجلی کڑکنے کی جیسی آواز آتی، کئی اور بھی قسم کے پرندے والد نے پالے تھے جن میں پیرو، بطخ اور چینی مرغی، قاز وغیرہ شامل ہیں۔

ہمیں کبھی کسی چوکیدار کو رکھنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ جوکوئی ہمارے آتا قاز پکارنا شروع کردیتا تھا اور پیچھے دوڑنے لگتا۔ مجھے بھی قاز سے بہت ڈر لگتا تھا کیونکہ وہ مجھے چونچ سے مارتا تھا۔ ہمارے یہاں بھینس بھی پلی تھی جس سے ہمیں دودھ ملتا تھا۔ والد اپنے ہاتھوں سے بھینس کو اروی اور بھونسا کھلاتے تھے۔ایک کم رنگ کی بھینس جو مٹک مٹک کر چلتی تھی، والد اس کا نام گوری رکھے۔اسی طرح سے ایک زعفرانی پر کی مرغی تھی جس کا نام مس کیندی رکھے، کیوں کہ وہ ناز وفخر سے چلتی تھی اسی کے ساتھ ایک بدمزاج لڑاکو کالا مرغا تھا جو بے وجہ سب کو ستاتا تھا اس کا نام صدر شوتے رکھے کیونکہ اس زمانے میں آفریقہ کے ایک مشہور صدر کونگو میں حکومت کے خلاف لڑ رہا تھا، ہمارے یہاں کوئی ایک چھوٹی سی بندریا چھوڑ چلے جو بے حد شرمیلی تھی۔ چادر میں اپنا سر چھپالیتی تھیں اس کو جمال بی کہہ کر پکارتے تھے، کہیں سے ایک جنگلی بلی ہمارے یہاں اپنا گھر بنالی اور ہمارے والد کے ساتھ ان کے ذکر و وظیفہ میں ساتھ دیتی تھی، اس کو انھوں نے اللہ جوائی کا خطاب دیئے۔

برسات کے موسم میں والد بیر بابوٹیاں جمع کر کے کاڑی کی ڈبیوں میں ہم سب بچوں کو دیتے کھیلنے کے لئے اور کالج سے واپسی کے وقت بھورے چھوٹے چھوٹے بُٹیوں میں لاتے تھے۔ہم سب کو کہتے تھے کسی کے بھونرے زیادہ انڈے دیں گے۔اس طرح ہمیں سمجھاتے تھے کہ انسان اور حیوانات میں فرق نہیں اور انسان کا فرض ہے کہ مخلوقات کو اسی طرح سے عزت ومحبت اور ہمدردی دے جیسا کہ ہم اپنے آپ پر رکھتے ہیں۔

انہوں نے ہمیں یہ بھی سکھایا کہ ہر شخص کو ادب وقائدے سے ملنا اور کبھی بھی ظاہر نہیں ہونے دینا کہ ان میں اور ہم میں فرق ہے، یہی سلسلے میں مجھے یاد ہے کہ ایک مہارتن اپنے غصہ دار شوہر سے لڑ کر اپنی ذات کو چھوڑ دی تھی، والد نے ایسے بھی پناہ دی، اس کا نام حسین بی رکھا، اس کی صورت پر چیچک کے داغ اور پھنسیاں تھے وہ ذرا بہری تھی ، والد صاحب نے اسے نہ صرف پناہ دی مگر انسانیت سے رکھا۔اسے خوش کرنے کے لئے خوبصورت بی یا مدھوبالا کہہ کر پکارتے تھے، جس سے وہ اپنے آپ میں خوش رہتی۔اسی طرح وہ ہمارے گھر کی مہترانی کو بہو کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ہمیں سمجھاتے کہ ہمارے گھر کے اندرونی طہارت خانہ صاف کرتی ہے، جو اور کوئی نہیں کرتا تو اس کا حق ہے کہ ہم سب گھر والے اسے عزت دیں، ایسا ان کا رویہ رہتا ہر نوکر اور غریب کے ساتھ۔

والد صاحب کو پکوان کا بھی شوق تھا۔سردیوں میں آم کے درخت کے نیچے جوز حلوہ بناتے ، ایک بڑے سے دیگچے میں والد صاحب کی محل کا یہ خاص پکوان تھا جس میں کئی قسم کی چیزیں پڑتی تھی جسے رات بھر پکایا جاتا پکنے کے بعد والد سب سے پہلے نوکروں کو دیتے تھے کہتے تھے کہ پہلے نوکروں کا حق ہوتا ہے۔اس کے بعد ان کے دوست احباب وغیرہ کو بھیجا جاتا اور ہمارے توشہ خانے میں بڑے سے مشقابوں میں سال بھر یہ حلوا رہتا اور کئی قسم کے مربے بھی رہتے تھے جس میں، آلو بخارا، شپاتی، امرود وغیرہ۔

والد صاحب کو بچپن سے ہی سیر و سیاحت کی عادت تھی انہوں نے کئی ہندوستان اور دیگر ممالک کا سفر کیا، اپنے عمر کے

آخری وقت تک ۔ جب وہ افغانستان میں تھے تو وہاں کا مشہور سالنگ پاس سے گذرنا پڑا۔ڈاکٹر نے کہا کہ پہاڑ بہت بلند ہیں اور آکسیجن کے سلنڈر کے بغیر وہ نہیں چڑھ سکتے ،اس مشورہ کے باجود انہوں نے چڑھا۔

شہر بلخ کے گورنر نے ان کی تعریف اور خوشی میں خاص بزکشی گھوڑوں کا کھیل رکھا اور تمام افغانستانیوں کو بتایا کہ کتنے مشہور خاندان کی شخصیت سے ہم سب کو ملنا نصیب ہوا۔

وہ اپنے تہذیب اور وطن پر فخر کرتے تھے غیر ملک میں جہاں وہ سفر کئے اپنے دین کو کبھی نہ بھولے اگر نماز کا وقت آتا تو فوراً اُسی جگہ پر جوتے اتار کر اپنے اپنا فرض ادا کرتے تھے۔ایک وقت پیرس میں ہمارے گھر کے قریب آئفل ٹاور (Eiffel Tower) کے نیچے کھڑے ہوئے تھے اور مغرب کا وقت تھا انہوں نے فوراً سلیم شاہی جوتے اتار کر اپنے رومال کو زمین پر رکھ کر نماز پڑھنا شروع کردئے ،ایک پولیس والا حیران ہوکر پوچھا کہ کیا کر رہے ہو۔ والد صاحب کو اٹھنے میں زرہ مشکل ہوتی اور وہ پولیس والے نے انہیں مدد دی والد صاحب اپنی انگریزی اور ٹوٹی پھوٹی فرنچ میں جواب دیئے۔''میں تمہارے ملک کے لئے دعا کر رہا ہوں'' وہ پولیس والا ان کا گرویدہ ہوگیا اور کہا میں آپ کی کیا خدمت کرسکتا ہوں، والد صاحب نے کہا میں تیرا شکر ادا کرنا چاہتا ہوں تو نے محبت سے مدد دیا اور اپنی ملاقات ہوئی

ان کی شخصیت ایسی شگفتہ مزاج کی حامل تھی۔ویسے ہی ہزاروں کا دل وہ جیت لیتے تھے۔ ان کی مزاج میں زرا شرارت بھی تھی اور سب کو ہنساتے تھے ، خوش مزاج تھے اور کبھی بھی دوسروں کو اپنے تکالیف یا درد نہیں سناتے تھے ،آج بھی لوگ ان کے شرارتی مزاج کے قصے یاد کرتے ہیں اور لوگ کہتے کہ ہمارے ذہن میں اردو لغت کی نزاکت کو زندہ رکھے۔

میں ایک شرارتی قصے کو ہمیشہ یاد رکھتی ہوں۔

''ہمارے والد کی چھوٹی بہن کو سنیما جانے کا بڑا شوق تھا وہ بعض وقت میٹنی شو Matine show کو مجھے ساتھ لے جاتی تھیں۔ میرے والد نہ پسند کرتے تھے۔ایک بار ہمارے واپس آنے میں دیر ہوگئی اور ہم اندھیرے میں ہمارے گھر کے سامنے قبرستان کے پاس سے تیز تیز چل رہے تھے۔ایک دم قبر کے پیچھے سے ایک بھوت کی طرح شخص کالی کمبل اوڑھے ہوئے روشن فرفز چشمہ پہنے ہوئے اور گلے کے اطراف چمکتی ہوئی تسبیح لے کر کود پڑا، ہم ایسا ڈر کے بھاگے توبہ کئے کبھی رات کے اندھیرے میں اکیلے سنیما کو نہیں جائینگے۔جب گھر واپس آئے ہمارے والد پوچھے دونوں ایسا کیوں گھبرائے ہوئے ہو۔تو ہم انھیں قبرستان کا قصہ سنائے۔تو وہ جواب دیئے کہ چوری کی حرکت کبھی نہیں چھپتی پھر ہمیں ان کے فرفزار چشمہ اور چمکتی تسبیح تحفہ میں دی یادگار کے لئے۔ اور خوب ہنسے۔

والد کو بے حد رنج تھا کہ جب وہ افغانستان گئے وہ صرف بادشاہ بابر کے مزار پر فاتحہ پڑھے صدر خاندان امیر تیمور کے مزا پر فاتحہ نہ پڑھ سکے، کیونکہ وہ سمرقند میں تھا، مجبوری سے انہوں نے مزارِ شریف کے بعد آمو دریا کو دور سے دیکھ کر فاتحہ پڑھنا پڑا۔

افغانستان کے سفر کے بعد وہ کابل سے دہلی گذرتے ہوئے حیدرآباد آئے۔ دہلی میں پریسڈنٹ فخر الدین احمد صاحب اور ان کی اہلیہ نے انہیں ایک ہفتہ مہمان رکھا۔فخر الدین صاحب نے ایک انٹرویو بھی خواجہ حسین نظامی ثانی کے ساتھ والد کا آل انڈیا ریڈیو پر کروایا تھا،خواجہ حسن نظامی نے انٹرویو میں جب والد صاحب سے سوال کیا کہ پہلے دور کی تہذیب اور آج کے دور کی تہذیب اور پہلے دور کے انسان اور آج کے دور کے انسان میں کیا فرق ہے ،تب والد صاحب نے جواب دیا کہ پہلے انسان اخلاق اور تہذیب کو توجہ دیتا تھا اور اپنی نظریات میں ایک دوسرے سے محبت کرتا تھا، دل ایک تھے حالانکہ رہنے سہنے کھانے پینے کے

طریقوں میں فرق تھا، روٹی الگ تھی۔ پر آج کے دور میں روٹی ایک ہوگئی مگر دل کے ٹکڑے ہوگئے۔

ایک عجیب واقعہ ہوا دہلی میں خواجہ صاحب میرے والد کو روکنا چاہے وہاں پر والد صاحب نے کہا کہ حیدرآباد میں میرے بہت سارے کام ہیں جنھیں مجھے ختم کرنا ہے۔ آپ خود آجایئے حیدرآباد خواجہ صاحب نے جواب دیا میں نہیں آسکتا مجھے ممبئی جانا ہے کام پر۔ اور واپسی حیدرآباد سے نہیں ہوسکتی والد صاحب نے انہیں جواب دیا ملاقات تو ہوگئی اور میں آپ کا انتظار کروں گا۔ دہلی سے واپس ہوئے ایک ہفتہ بھی نہ ہوا تھا، والد صاحب کا انتقال 5/نومبر 1976 کو ہوا۔ اس دن وہ دن بھر دوستوں سے ملے اور گھر کے کاموں میں مصروف رہے، دوپہر میں ایک تعلیمی تقریب میں بھی شرکت کئے۔ اسی دن وہ ہمارے خاندانی جوہری سے خدا حافظی کرنے گئے جو پتھرگٹی پر رہتا تھا۔ ہماری والدہ نے انتقال سے پہلے جوہری کے پاس اپنا زیور رکھایا تھا وہ چالیس سال بعد واپس کیا والد اس کی ہمدردی کبھی نہیں بھولے۔

شام گھر آئے یکا یک طوفانی بارش شروع ہوئی۔ میں فکرمند تھی کہ یہ تھک گئے ہونگے۔ برسوں سے دل کے مریض تھے قلب کے کئی دورے ہندوستان اور یورپ میں بھی پڑ چکے تھے لیکن ذرا بھی اپنے آرام کا خیال نہ رکھا۔ حسب عادت شام کو کھانا 7 بجے ختم کیا اور پلنگ پر نشست لی۔ اطراف میں افراد خاندان اور بعض دوست قالین پر بیٹھ گئے اور باتیں شروع ہوئیں۔ میں نے اس قدر دلچسپ قصے اور واقعات بشاش اور شگفتہ اسلوب پہلے نہیں سنے تھے۔ جادو بیانی تھی کہ زبان کا طلسم سب ہنس رہے تھے۔ میرے ساتھ میرے بھائی سرتاج حسن چاند بھاوج، رقیہ بیگم اور ان کا لڑکا میر رفعت علی خان، ڈاکٹر خالد میری پھوپھی کے نواسے، میڈیم پلاس من اور جرمن مدید ہمہ تن گوش تھے۔ اتنے میں ڈاکٹر منان کمرے میں داخل ہوئے۔ والد محترم نے گرم جوشی سے خیر مقدم کیا۔ ڈاکٹر صاحب ان کی طرف متوجہ ہوئے والد محترم خاموشی سے تکیوں پر لیٹ گئے۔ آنکھیں بند کرلیں اس سے کچھ دیر قبل مجھ سے مخاطب ہوکر کہا تھا کہ شہزادی میرے آنکھوں کے سامنے سے نہ ہٹنا۔

ہم سمجھے تھک کر لیٹ گئے ہوں گے۔ ڈاکٹر صاحب کو شک ہوا۔ انھوں نے پوری کوشش کی لیکن روح ملک عدم کو پرواز کرچکی تھی۔ ہنستے ہنساتے دلوں کو مسخر کرکے آناً فاناً چلے گئے۔ ہم پر قیامت ٹوٹ پڑی اوسان قطع تھے اور دل و دماغ پارہ پارہ کہتے ہیں کہ شہنشاہ عالمگیر کے آخری دنوں میں یہ شعر ان کی زبان پر رہتا تھا

به ایک لحظہ به یک ساعت به یکم دم
دگرگوں می شود احوال ِ عالم

یہ شعر اس گھڑی ہماری کیفیت کی تفسیر تھا میں ان کی اولاد میں سب سے بڑی تھی گھر کی ذمہ داریاں اس پرآشوب وقت میں مجھ پر آپڑی۔ اتفاق خواجہ صاحب والد کے تدفین میں موجود تھے۔ ہوائی جہاز کی خرابی کی وجہ سے انہیں حیدرآباد رکنا پڑا، ہمارے گھر خوشی سے اچانک پہنچے، جو میرے والد ایک ہفتہ پہلے کہہ رہے تھے وہی ہوا، ملاقات کے بجائے بڑے صدمے میں جنازے میں شرکت انجام دیئے۔

فیاض الدین صاحب حیدرآباد کے چیف آرکیٹکٹ تھے۔ انھوں نے اپنی قبر کی جگہ جو خطّہ صالحین میں تھی میرے والد صاحب کے تدفین کے لئے دے دی۔ انھوں نے چیف جسٹس شرف الدین صاحب کے ساتھ تدفین کا انتظام کیا اور خواجہ صاحب نے فاتحہ پڑھی۔

میں نے اپنے والد کی میت کے منور چہرے کی طرف رخ کرکے عہد کیا کہ ان کی نصیحتوں کو فراموش نہ کروں گی۔ ان کے مضامین اور تقاریر کو یکجا کرکے کتابوں کی شکل میں دنیا کے سامنے پیش کروں گی۔

والد کے انتقال کے وقت میرے شوہر میر معظم حسین افغانستان میں یونسکو مشن کی خدمات انجام دے رہے تھے۔ والد کو ہندوستان آنے سے پہلے وہاں خدا حافظ کی تھی، ہمارے پانچوں بچے ہندوستان سے باہر تھے۔

تین دن کے اندر میرے شوہر افغانستان سے اور میرا بڑا لڑکا میر سرفراز حسین پیرس سے پہنچ گئے جن کے آنے سے ہمیں بہت تقویت ملی۔

والد کے شاگردوں اور دوستوں سے بڑی تعداد میں ہم سے اظہار ہمدردی اور تعاون کیا اور ہمارے غم میں شریک رہے۔ میرے شوہر میر معظم حسین نواب رئیس جنگ کے بڑے صاحب زادے اور نواب فخر الملک کے پوتے ہیں اور میرے والد کے نظام کالج میں شاگرد رشید بھی تھے۔ ان کی غیر معمولی علمی و ادبی اور ترقی پسند قابلیت کو دیکھ کر وہ راضی ہوئے، جب وہ میری نسبت کا پیغام لائے، ان سے میرا نکاح 1943ء میں دہلی میں ہمارے خاندانی محل صرائے میں ہوا صرف چند دوست و احباب کی موجودگی میں

ہمارے خاندانی اصولوں کے مطابق ہوئی۔ نکاح کے وقت مجھے شہزادی زینت محل کا خاندانی خاص جوڑا پہنایا گیا۔

میرے شوہر نے یونسکو سے معیاد ختم ہونے سے قبل ہی وظیفہ لے لیا تا کہ میرے مقصد اور گھریلو زندگی میں میرا ہاتھ بٹائیں۔ ہم دونوں نے یہ طے کیا کہ جس طرح انگلستان اور یوروپی ممالک میں شیکسپیئر، وکٹو ہیوگو، ڈیوماس کیٹس اور ٹالسٹائی کے مکانات کو میوزیم میں تبدیل کیا گیا ہماری گنگا جمنی اور دکنی تہذیب کو زندہ رکھنے کے لئے اس طرح والد صاحب کے بنائے ہوئے رہنے اور بیٹھنے کے مکان حیدر منزل کو ایک کلچرل سنٹر میں تبدیل کر دیا جائے۔ ان کا مکان والد محترم نے اپنی زندگی میں مجھے اور میری اولاد کو عطا کر دیا تھا۔ اس کلچرل سنٹر کو کتب خانہ نوادارات قلمی تحریروں اور تصویروں مشہور مشاہیر کے خطوط لکھے ہوئے مضامین اور تصاویر کے مسودے ان کے استعمال کی اشیاء سے آراستہ کیا جائے گا۔ والد محترم کو پرانی اور تاریخی چیزیں جمع کرنے کا بڑا شوق تھا اور پرکھنے کی صلاحیت بھی خداداد تھی۔ اس کام کی تکمیل میں کافی وقت صرف ہوا۔ فہرستیں اور کتب خانے کے انڈکس کارڈس تیار کرنا تھا۔ میرے شوہر اس کام میں بے حد منہمک رہے۔ باوجود خرابی صحت کے روزانہ گھنٹوں کام میں لگے رہے میرے والد صاحب کے مضامین مختلف رسائل میں چھپتے تھے۔ ان کے انتقال کے چند سال بعد تک ان کی تحریریں یونیورسٹی کے اردو نصاب میں شامل تھی اور کئی ریسرچ اسکالرس میرے شوہر سے ملنے آتے تھے۔ میرے والد پر ریسرچ کرنے کے لئے۔ ان کا یہ ریسرچ کا کام آسان نہیں تھا کیونکہ بہت ساری تحریریں خستہ حالت میں تھیں اور کتابیں کو دیمک لپٹی ہوئی تھی۔ اس کے علاوہ اپنی زندگی میں انھوں نے بہت سارے قدیم نسخے اور کتابیں کتب خانوں، ریسرچ اسکالرس اور یونیورسٹی کو تقسیم کر دی تھیں۔ ان کی علی گڑھ کی طالب

علمی کی زندگی میں ان کے ابتدائی مضامین پر مشتمل کتاب پس پردہ 1926ء میں چھپی تھی۔ بڑی تلاش کے بعد اس کا ایک نسخہ ہاتھ آیا۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد اس کا دوسرا ایڈیشن منظر عام پر لایا گیا۔ کلچرل سنٹر کے کمروں میں نوادرات ترتیب دیئے گئے۔ ورانڈے میں تخت جہاں وہ اکثر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کے دوستوں سیاسی اور ثقافتی شخصیتوں کی تصاویر آویزاں کی گئیں۔ ساتھ ہی ساتھ مشاہیر کے خطوط آغا صاحب کے نام یا ان کے متعلق جمع کر کے ترتیب دیئے گئے اور مجھے یاد ہے جب 1942ء میں ایک دکنی کتابوں پر نمائش کی گئی تھی والد صاحب اس پر نا صرف مدد دیئے اپنی بہت ساری دکنی کتابیں اور دکنی تصاویر اور لباس تحفہ عطا کئے۔ اور ان کے خاص شاگردوں کی دلچسپی دکنی سے بڑھائے اور ریسرچ میں مدد دیئے۔ میرے والد کو دکنی زبان سے بے حد ذوق و شوق تھا۔ وہ اردو کی ایسی خدمت کرنا چاہتے تھے

جیسے حالؔی، شررؔ اور آزادؔ نے کیا۔

والد کو نہ صرف سیر و تفریح کا شوق تھا بلکہ انہیں بھی انگریزی کے مشہور شاعر ورڈسورتھ کی طرح مناظر قدرت کے دلدادہ تھے اور فطرت کی ہر چیز میں حسن تلاش کرتے تھے۔ ان کا مطالعہ سرسری نہ ہوتا بلکہ ہر چیز اور ہر منظر کا مطالعہ گہرائی کے ساتھ کرتے اور یہ صرف وقتی نہ ہوتا اللہ تعالیٰ نے ان کو غضب کا حافظہ عطا فرمایا تھا کہ یہ سب ان کے ذہن میں برسوں محفوظ رہتا اور بیان کرنے پر آئیں تو ایسا پیارا نقشہ کھینچتے کہ سامعین بھی ان مناظر کے جز بن جاتے۔ تاریخی مقامات دیکھ کر ان کے پس منظر کی تحقیق کر کے عمارات کے مختلف حصوں کے نام زیورات اور کپڑوں کے اقسام ان کے تراش مردوں کے لباسوں کے نام موسوم کے علاقائی اور سب کچھ ان کے از بر تھے اور حیوانات کے آوازوں کا انہیں گہرا علم تھا ان کے مضامین میں یہ سب کچھ ہے، انسانی دستکاری اور کاریگری کو وہ بہت اہمیت دیتے تھے اور اچھی مصنوعات کی قدر اور تعریف کرتے ان کی نظر جوہر شناس تھی۔ تقاریب کے کام رسومات اور اس کے لوازم کا گہرا علم تھا۔ حیدرآباد کی سیر ان ہی کے مضامین کی دوسری تصانیف ہے۔ جس میں باریک بینی اور دلچسپی سے والد صاحب نے شہر حیدرآباد کے مختلف حصوں کا ذکر کیا ہے۔ نہ صرف تاریخی پس منظر بلکہ انفرادیت مزاج، بول چال، لب ولہجہ اور ان کی شہر سے محبت اور یگانگت سب ہی عیاں ہے۔ نامپلی پر مرزا صاحب ریل سے اترتے ہیں۔ یہیں سے یہ تجسس کا عنصر دکھائی دینے لگتا ہے۔ انداز بیان گو کہ مزاحیہ ہے مگر ایسی مزاح میں معاشی، ثقافتی، تعمیری حالات پر تفصیلی روشنی ڈالتے ہیں۔ چاہے لاڈبازار کا ذکر ہو یا میر عالم منڈی پرانی حویلی دیوان کی دیوڑھی، عابد روڈ، ہر چیز کو نئے رنگ میں پیش کیا ہے۔ حیدرآباد کے باہر کے مقامات نرمل، ماہور کا مشہور مندر، کیلاسپور کی جاترا جو لوگ ان مقامات سے واقف ہیں حیرت کریں گے کہ اتنے سے مختصر سفر کے دوران انھوں نے کس طرح یہ سب کچھ دیکھ لیا اور نئے اسلوب اور مضمون میں قلم بند کیا ہے۔ جو اس طرف نہیں گئے وہ بھی پڑھ کر خوش ہوں گے کہ نئے معلومات سے فیض یاب ہوئے۔ اقبال پر جو مضمون ہے عقیدت میں ڈوبا ہوا ہے، والد صاحب کو بے حد رنج تھا کہ جب وہ آخری دفعہ اقبال سے کچھ پوچھنے گئے تھے اقبال انہیں زیادہ وقت نہیں دے سکے، کیونکہ وہ بیمار تھے اور چند دن بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

ابھی کافی مضامین کو جو باقی بچ گئے ہیں۔ منظر عام پر لانا ہے ہم کوشش کر رہے ہیں کہ آغا حیدر کلچرل سنٹر سے چند ماہ بعد شائع کریں۔ مضامین کے علاوہ بہت سے ان کے خطوط اور محاورے اور نئے الفاظ برسوں کی تحقیق کے بعد وضع کئے ہیں ان کو پیش کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس کے علاوہ ہم نے والد صاحب کی آواز ان کے قصے، کہانیاں، تاریخی اور علمی معاملات وغیرہ کو ٹیپ کر رکھا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ انھیں CD پہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر رکھے۔ تاکہ آنے والی نسلوں کے کام آئے۔ انھیں خود مزہ آئے ان کی خاص آواز لب ولہجہ وشگفتہ بیانی کو سن کر اکثر لوگ ان کی خاص بیگماتی زبان سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کہتے تھے کہ ان کا لہجہ اور تلفظ ندرت زبان ہے۔ جو دلی کے لال قلعے میں بولی جاتی تھی۔ ہم کوشش کریں گے ان کی آواز بھی سنائی جائے۔ اس کلچرل سنٹر میں جن اصحاب کو تحقیقی دلچسپی ہو ان کے ساتھ پورا پورا تعاون کیا جائے گا۔ ہمارے خاندان کے افراد میر سرفراز حسین، میر اکبر حسین، ڈاکٹر میر اصغر حسین، ڈاکٹر فاطمہ شہناز، بیگم سلطانہ حسین اور ان کی اولاد کا یہی ایک بلند مقصد ہے۔

☆☆☆

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیرجی/اشرف رفیع

آغا چچا چند باتیں چند یادیں

عموماً پاپا کے پاس بلیرڈ روم میں ہرطرح کے لوگ آیا کرتے تھے وہ وہاں کبھی رمّی کھیلتے تھے تو کبھی بلیرڈ ان لوگوں میں آغا چچا بھی ہوا کرتے تھے۔ان کے آتے ہی بلیرڈ روم میں بڑی رونق آجاتی تھی روز کا جو ماحول ہوتا تھا وہ بدل جاتا تھا۔ بڑی چہل پہل ہو جاتی تھی۔ہم بھی جا کر کہیں نہ کہیں بیٹھ جاتے تھے۔وہاں موجود لوگ آغا چچا سے اپنی پسند کی فرمائش کرتے۔کوئی کہتا قلعہ معلیٰ کی زبان میں کچھ بولیے۔کوئی کہتا دلی کی بیگماتی زبان میں کچھ سنایئے کسی کو خواہش ہوتی دکنی میں کچھ بولیے وہ سب کی سنتے سب کی خواہش پوری کرتے خود بھی خوش ہوتے اور لوگوں کو بھی خوش کرتے تھے۔سب سے باتیں ختم ہوتیں تو ہماری طرف آتے۔مجھ سے ایک دن کہا میں شہزادی اسریٰ کو اردو سکھا رہا ہوں آپ کے بارے میں بھی اچھی اچھی باتیں شہزادی اسریٰ سے کہتا ہوں۔میری سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ میرے بارے میں اتنی زحمت کیوں کر رہے ہیں۔ پاپا سے کہتے آپ کی بڑی بچی بڑی ہوشیار ہے۔ میں ہوشیار تھی یا نہ تھی مجھے معلوم نہیں۔

وہ ہمارے گھر کی دعوتوں میں اکثر شریک رہتے تھے جب بھی تشریف لاتے ہاتھ میں ایک تسبیح ضرور ہوتی تھی سب سے ملتے بڑے سلیقے سے سب کو آداب کرتے آداب لیتے اور ایک طرف جا کر بیٹھ جاتے لوگ خود جا جا کر ان سے ملتے تھے۔آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ Drink لیتے تو آغا چچا شربت پیتے تھے۔

اس زمانے میں، میں فاطمہ شہزادی اور میر اصغر نواب کو نہیں جانتی تھی وہ شاید بھائی کے ساتھ پیرلیس میں رہتے تھے۔مگر شہزادی مہرالنسا بیگم صاحبہ سے کبھی کبھی ملاقات ہو جاتی تھی میں جا کر ان سے ملتی تھی۔شہزادی مہرالنسا بیگم میری چچازاد بہن رانی جیٔ دیوی کی بچپن کی دوست ہیں۔رانی جیٔ دیوی راجا پرتاب گیرجی کی بڑی صاحبزادی تھی یہ دوستی تین چار برس کی عمر سے قایم رہی دونوں پہلی دفعہ ممبئی میں گوالیار کے سمدر محل میں ملے تھے۔رانی جیٔ دیوی کے اانتقال تک یہ دوستی برقرار رہی۔دونوں ایک ہی اسکول محبوبیہ میں پڑھتے تھے۔ ان کی دوستی کے بہت سے قصے آپا حضور (شہزادی آپا بیگم مہرالنساء) جب بھی ہماری ملاقات ہوتی ضرور سناتی ہیں آغا چچا نے پرنسس درّشہوار کو اردو سکھائی تھی۔شہزادی درّشہوار اچھی اردو بولتی تھیں۔

بہت عرصے بعد نواب میر اصغر حسین شہزادی فاطمہ شہناز اور بیگم سلطانہ حسن سے ملاقات ہوئی۔بیگم سلطانہ حسن کے شوہر نامور سائنٹسٹ سراج الحسن صاحب ہیں۔نواب اصغر کے دیگر دو بھائی میر سرفراز حسین اور میر اکبر حسین ہیں۔اور میر سرفراز حسین نے مجھے بتایا کہ ایک وقت سوئٹزر لینڈ کے سفر میں میری بہن راجکماری رینوکا دیوی اور وہ ایک ہی پلین سے سفر کر رہے تھے۔پتہ نہیں میرے دل میں کیا بات آئی میں نے ان سے پوچھا سرفراز آپ نے رینوکا سے شادی کیوں نہیں کر لی۔کہا میں ان سے اس کے بعد کبھی ملا ہی نہیں۔

آغا چچا گانے اور ڈانس پارٹی میں ہمیشہ آتے تھے۔ میری عمر کے پُر بہار دنوں میں آغا چچا کی بڑی خوش گوار یادیں بھری پڑی ہیں۔

آغا چچا کے اور مہاراجہ سرکشن پرشاد کے بڑے گہرے تعلقات تھے۔نواب میر معظم حسین سے شہزادی آپا کی شادی کے وقت انہوں نے ایک شاندار سہرا بھی لکھا تھا۔ جب آغا چچا کے بچے چھوٹے چھوٹے تھے مہاراج شام کے وقت ہمیشہ ان کے گھر ضرور

جاتے تھے۔ باہر موٹر میں بیٹھے رہتے بچے آ کر نہیں سلام کرتے مہاراج انہیں اشرفی کی اٹھنی دے کر واپس ہو جاتے تھے۔

میر معظم حسین کے دادا نواب فخر الملک کا کھانا غیر معمولی ہوتا تھا صبح اٹھ کر صرف دودھ پی لیتے تھے اس کے بعد گوشت خاصی مقدار میں تناول فرماتے تھے کسرت کرتے تھے۔ان کے پیلیس میں کئی لوگ تھے انگریزی کوک Goan تھا۔ ہمارے حیدرآبادی لوگ پہلے انگریزی کھانا کھاتے ہیں بعد میں ہندوستانی، نواب صاحب کے پاس ہرڈش کے لیے ایک کوک الگ ہوتا تھا۔

مجھے یاد ہے فخر الملک کے یہاں محرم میں علم بیٹھا کرتے تھے جس دن علم اٹھائے جاتے تھے دیوڑھی میں بڑا شور بڑا ہنگامہ رہتا تھا۔علم مبارک گیٹ تک جاتے اور پھر لوٹ جاتے تھے انہیں دیکھنے کے لیے سارے خاندان والے اس دن دیوڑھی میں آ جاتے تھے۔کہا جاتا ہے کہ فخر الملک کی ایک صاحبزادی سالار جنگ اول کو دی گئی تھی نواب صاحب کے بڑے بھائی خانخاناں بہادر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ۔ خانخاناں کے بڑے صاحبزادے نواب کمال یار جنگ تھے جن کی دیوڑھی میر عالم منڈی کی گھڑیال کے سامنے تھی۔

نواب میر معظم حسین نواب فخر الملک کے پوتے تھے ان ہی سے شہزادی آپا کی شادی ہوئی تھی۔

یہ یادیں مجھے جھلملاتی ہوئی جھلکیوں کی طرح آج بھی سامنے آتی ہیں حیدرآباد کی یہ حسین یادیں ہیں کیسے بھلا سکتی ہوں خوشی ہے کہ آج ہم آغا چچا پر ماہنامہ ''سب رس'' کا ایک خصوصی شمارہ نکال رہے ہیں۔

بیگ احساس

کا

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ

افسانوں کا مجموعہ

دَخمہ

قیمت: -/200روپے

عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی۔۹۵

فاطمہ عالم علی

مضمون

چند یادیں

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ کسی ایسی ہستی پر قلم اٹھانا بہت آسان ہے جس کو آپ نے بہت قریب سے دیکھا ہو بے شک بہ ظاہر یہ بہت آسان معلوم ہوتا ہے لیکن معاملہ اس کے برعکس ہے مشکل اس وقت آ پڑتی ہے جب آپ جانی پہچانی اور عزیز شخصیت پر واقعی لکھنے بیٹھ جائیں۔ اس وقت ہوتا یہ ہے کہ اس ہستی سے وابستہ یادیں یلغار کرتی ہیں اور ذہن کے پردے پر سینما کی تصویروں کی طرح گزرنے لگتی ہیں یہی نہیں بلکہ ہر یاد یہ اصرار کرتی ہے کہ پہلے ہمیں لکھوا! پہلے ہمیں لکھوا! اور اس وقت یادوں کے ہجوم سے چند یادوں کا انتخاب کرنا بہت دشوار ہو جاتا ہے۔

آغا چچا کے ساتھ بیتے ہوئے دنوں کے نقش کچھ یوں بھی زیادہ گہرے ہیں کہ انہوں نے مجھے کچھ زیادہ ہی سر چڑھا رکھا تھا میری کسی بات کو رد کرنے کبھی تو میرے کہنے پر کسی بات کے لیے جی نہ چاہتے ہوئے بھی راضی ہو جایا کرتے تھے مثلاً ایک مرتبہ کالج کے لڑکے ان کی صدارت میں ادبی محفل رکھنا چاہتے تھے لیکن چچا نے معذرت کر لی لڑکے میرے پاس آئے کہ ان کے ساتھ چل کر سفارش کر دوں پہلے تو میں نے ٹالنا چاہا لیکن ان کا اصرار بڑھتا ہی گیا تو میں ان کے ساتھ آغا چچا کے یہاں پہونچی۔ مجھے دیکھے ہی طالب علموں سے بولے اچھا ''اسے لے کر آئے ہو! خوب میری کمزوری سے کام نکالا! اب انکار تو نہیں کر سکتا ضرور آؤں گا۔ مگر بیٹا مجھے لینے آجانا یہ تھا'' ان کا محبت بھرا رویہ میرے ساتھ!!

اکثر ان کی یاد آتی ہے تو آج میری نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور بہت پیچھے چھوٹے ہوئے بچپن کے وہ دن ایک ایک کر کے سامنے آنے لگتے ہیں اور جی بے چین ہو اٹھتا ہے۔

درمیانے سے کچھ نکلتا ہوا قد، چوڑے شانے سنہری لمبے بال بڑی بڑی سبزی مائل شریر آنکھیں جن میں شوخی بھی ذہانت بھی محبت اور مروت کے ساتھ ساتھ انسان کو پرکھنے کا سلیقہ بھی چہرہ داڑھی مونچھ سے آزاد، شہابی رنگت، لباس میں ریشمی کرتا ریشم ہی کا چوڑی دار پیر میں سلیم شاہی غرض سر تا پا مغل ہی مغل یہ ہیں وہ آغا حیدر حسن مرزا جن سے میں پہلی بار نہ جانے کب ملی تھی۔ لفظ ''پہلی بار''۔ رسماً ہی کہہ لیجئے ورنہ آغا صاحب تو پہلی بار ہی یوں ملتے جیسے برسوں کی ملاقات ہو کچھ اس طرح اور ایسے ڈھنگ سے ملتے کہ ان کے حجرے میں داخل ہوتے ہوتے پہلی ملاقات کا تصور ہی مٹ جاتا۔ سلام دعا کی نوبت بھی نہ آنے پاتی ایسی پھلجھڑی ہی چھوڑ دیتے کہ ہنسی کے فواروں میں تکلف کی دیوار ڈھہ جاتی ہنسی رکتی تو آنے والے کے خاندان کا حال احوال اس طرح پوچھتے جیسے اس کی سو پشتوں سے واقف ہوں (اکثر واقفیت نکل بھی آتی تھی) بھلا بتایئے پہلی ملاقات کا سوال ہی کہاں پیدا ہوتا۔

ہم نے بچپن میں اپنے خاندان کے علاوہ ایک اور کنبہ بھی دیکھا وہ تھا علیگی گھرانا یوں سمجھئے کہ اگر کسی نے چھ مہینے بھی علی گڑھ میں پڑھا لیا تو علیگی خاندان کا فرد بن گیا اس کے بعد دنیا کے کسی حصے میں چلے جایئے ایک علیگی دوسرے علیگی کو ڈھونڈ نکالے گا۔ چناں چہ آغا حیدر علیگی حیدرآباد میں موجود تھے اب قاضی عبد الغفار کو حیدرآباد آنے میں کیا قباحت تھی! چلے آئے اور آغا حیدر کے دولت خانے یعنی حیدر منزل میں معہ بیوی اور ایک عدد بیٹی کے ڈیرا ڈال دیا۔ ایک آدھ دن نہیں مہینوں رہ پڑے نہ جانے اس زمانے کے دوست کس مٹی کے بنے ہوئے تھے۔ ایک دوسرے سے بیزار ہی نہ ہوتے تھے شام ہوتی تو دو چار اور علیگی جمع ہو جاتے اچھی خاصی محفل سج جاتی کاش اس وقت ہم میں اتنا شعور ہوتا کہ نہ

صرف یہ کہ ان محفلوں کا لطف اٹھا سکتے بلکہ ان کی اہمیت کو بھی سمجھ سکتے ذرا سوچئے تو آج اس انتشاری دور میں وہ محفلیں بزرگوں کا ورثہ بن کر ہمارے پاس محفوظ ہو جاتیں۔ افسوس کس طرح دبے پاوں وقت نکل گیا...!

آغا حیدر حسن کے دوستوں کا حلقہ بھی کافی وسیع تھا اور دوست بھی ایسے جو خود بھی کسی نہ کسی حیثیت سے مشہور و معروف شخصیتوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ مثلاً سید حسین، خورشید احمد خاں، ڈاکٹر سلیم، خلیق الزماں غلام محمد، قاضی عبدالغفار، ڈاکٹر یوسف حسین خاں، غلام پنجتن اور علامہ حسرت بدایونی ان میں سے بعض ہستیاں تو مجھے یوں یاد ہیں جیسے کل کی بات ہو۔

آغا حیدر حسن آثار قدیمہ نہیں بلکہ دلی کی گمشدہ تہذیب کی جیتی جاگتی مورت تھے وہ ایک ایسی کڑی تھے جو ایک نسل کے ورثے کو دوسری نسل سے جوڑتی ہے۔

قلعہ معلیٰ اجڑ گیا تھا مغلوں کی دلی پر انگریزوں کو تسلط جمائے تیس سال ہو چکے تھے۔ تاہم در و دیوار سے رنگ اڑا نہیں تھا محبت و مروت کی بو ابھی میں باقی تھی۔ تباہی کی داستانیں ذہنوں میں زندہ تھیں کہ مصطفیٰ خاں کی حویلی میں 14/اگست 1893ء میں آغا حیدر حسن نے جنم لیا۔ سارا بچپن خاندان کے اکیس پھانسی پانے والوں کی یاد میں دکھ بھری کہانیاں سنتے اور بھولی بسری یادوں کو دہراتے بزرگوں کی آغوش میں گزرا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ آغا چچا نے ان دنوں کی یاد کو تازہ رکھنے کے لیے زبان رہن سہن، لباس عادات واطوار اور آداب کو اپنی ذات پر فرض کر لیا اور مرتے دم تک اس فرض کو نبھاتے رہے۔

دستور کے مطابق ابتدائی تعلیم گھر کے مکتب میں ہوئی پھر دلی کے اسکول میں داخل کر دیئے گئے اعلیٰ تعلیم کے لیے سرسید کے علی گڑھ پہونچ گئے۔ وہاں کے زندہ دلوں نے ان کی بول چال کی فصاحت رہن سہن کی تھلمنا ہٹ اور لباس کی رنگینی و نفاست کی وجہ سے ان کو آپا جان کا خطاب دے دیا پھر تو یہ ہونے لگا کہ جس کو دلی کی بیگماتی زبان سے لطف انداز ہونا ہوتا ان کے کمرے کا رخ کرتا۔ آغا صاحب کے شاگردوں کا کہنا ہے کہ کتاب تو شاذ ہی ہاتھ میں لیتے ہوں ان کی تو زبان ہی کتاب تھی فصاحت و بلاغت تو کتاب میں مل سکتی ہے لیکن آغا صاحب کے لہجے کی شگفتگی اور لوچ تو بس انہیں کا حصہ تھی چناں چہ آغا صاحب نے بیگماتی زبان ہی کو اظہار کا ذریعہ بنایا جب لکھنا شروع کیا تو اپنے ساتھیوں کے دیئے ہوئے خطاب کو نام کا جز بنا لیا اور ''آپا حیدر'' کے نام سے اپنے کو متعارف کرایا اور اپنے منفرد لب و لہجے کی وجہ سے لکھنے والوں میں منفرد مقام پایا۔

جب سیاست کی پرچھائیاں علی گڑھ پر پڑھنے لگی تو علی برادران حکیم اجمل خاں، اور گاندھی جی کی مخالف سرکار سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا نتیجہ ظاہر تھا!! دلی اور علی گڑھ دونوں کو خیر باد کہنا پڑا اور دکن کا رخ کیا۔ یہاں آ کر تو ایسے بسے کہ حیدرآباد وطن ثانی بن گیا۔ قدم جمانے کے لیے طبیعت کے خلاف کچھ دن پولیس کی ملازمت کی پھر کالج میں اردو پڑھانے لگے۔ اس دور کا حال تو ان کے شاگرد ہی مزے لے کر سنا سکتے ہیں لیکن حقیقت تو یہ ہے کہ حیدرآباد کی فضا ان کو خوب راس آئی اور کیوں نہ آتی آغا حیدر حسن کا قلعہ معلیٰ سے قریبی رشتہ تھا درباری آداب و تہذیب ان کی گھٹی میں پڑے تھے حیدرآباد آئے تو یہاں بھی رؤسا امراء کی صحبتیں میسر آئیں۔ یہ فرق مراتب کا بڑا خیال رکھتے تھے۔ شاہی خاندان پر برا وقت پڑنے کے بعد بھی ان کا رویہ اس خاندان کے ساتھ نہ بدلا درباری آداب کو ہمیشہ ملحوظ رکھا۔ یوں تو اپنی ذات سے وہ بالکل قلندر تھے۔ درباداری بھی جلب منفعت کے لیے نہیں بلکہ دل کو خوش رکھنے کا محض بہانا تھا نہ کسی کے عہدے سے مرعوب ہوتے نہ ہی کسی غریب کو دیکھ کر منہ پھیرتے امیر غریب میں امتیاز کرنا ان کی سرشت ہی میں نہ تھا نہ جانے کتنے غریب لڑکوں کی انہوں نے تعلیم

بھی دلوائی اور روز گار سے بھی لگایا۔''خیرات اس طرح دو کہ دوسرے ہاتھ کو خبر نہ ہو' کی زندہ مثال تھے۔غریب طالب علموں میں یقین جاننے دھوبی اور مہتروں کے لڑکے تک شامل تھے۔ ہر طبقے اور ہر عمر کے لوگوں میں یہ یکساں عزیز تھے۔ وضعداری کا یہ حال تھا کہ جس سے ایک دفعہ جس طرح مل لیے اخیر دم تک اس انداز میں فرق نہ آیا۔

آغا چچا بے حد شگفتہ مزاج تھے بچوں میں بچہ جوانوں میں جوان بڑی آسانی سے بن جاتے لیکن بوڑھوں میں بوڑھے بن بیٹھنا ان کے لیے تقریباً ناممکن تھا۔رگ ظرافت ہر وقت پھڑکتی رہتی۔اردو کی کلاس ہو یا جلسے کی صدارت محفلیں قہقہوں سے گونجتی تھیں۔ بہت پرانی بات ہے اور اردو ہال میں آل انڈیا مشاعرے کا اہتمام کیا گیا تھا۔ اب سے تیس سال پہلے کے مشاعرے کا تصور کیجئے کیسے کیسے شعرا جمع نہ ہوئے ہوں گے شعرا کو سمجھ کر داد دینے والوں کی بھی کمی نہ تھی۔ چوٹی کی غزل گو شاعر اس مشاعرے کی صدارت فرما رہے تھے مشاعرہ شروع ہوئے مشکل سے آدھا گھنٹہ گزارا ہوگا ایک گوری چٹی بزرگ خاتون تشریف لائیں اور سیدھی اسٹیج پر پہونچ کر صدر صاحب کے پہلو میں جا بیٹھیں۔گوری بھبو کا مسماۃ کو گہرے رنگ کے صدر کے قریب بیٹھے دیکھ کر بھلا آغا چچا کا ہے کو خاموش رہتے میں ان کے قریب ہی بیٹھی تھی۔میری طرف جھک کر سرگوشی کے انداز میں بولے''لو بیٹا دن رات ایک جگہ ہوگئے'' کچھ اس قدر بے ساختہ انہوں نے یہ جملہ کہا کہ میرے لیے ہنسی پر قابو پانا مشکل ہو گیا میری حالت پر خود بھی کھل کھلا کر ہنس پڑے قضا کے بے رحم ہاتھوں نے سب ہی کو چھین لیا نہ وہ دن رات تھے اور نہ ہی آغا چچا۔

میری شادی سے پہلے کا واقعہ ہے جس گھر میں ہم رہتے تھے وہ جگہ مجھے پسند نہ تھی۔ایک دن آغا چچا آئے اور میری جو شامت آئی تو باتوں باتوں میں میں نے کہا'' آغا چچا ہمارے لیے کوئی گھر دیکھئے نا'' میرے منہ سے بات پوری ہونا تھا کہ وہ لے اڑے ابّا کی طرف دیکھ کر بولے دیکھ لیا جوان بیٹی کو گھر میں بٹھانے کا نتیجہ؟ باوا نے گکر نہ کی تو چچا سے کہنا پڑا کہ اس کے لیے گھر دیکھو''پھر مجھے بولتے بیٹا صدقے جاوں ضرور تیرے لیے گھر دیکھوں گا کچھ تو تیرے باوا کو غیرت آئے گی'' اور پھر تو جتنی دیر بیٹھے مجھے یوں چھیڑتے رہے جیسے کوئی ساتھ کی کھیلی سہلی ہوں۔ مذاق پر اتر آئے تو کسی کو نہیں بخشتے تھے۔

ایک دن ان کی بیٹی شہزادی کے یہاں دن گزارنے پہونچ گئی۔ گیٹ میں داخل ہوئی تو سامنے ہی مل گئے دیکھتے ہی بولے''بیٹا سہیلی کی چاہت میں تو نے یہ بھی نہ سونچا کہ آج تیس تاریخ ہے!! اور چچا تیرا چاکر آدمی ان تاریخوں میں کس بھلے آدمی کی جیب میں ٹکے ہوتے ہیں ذرا تو چچا کی لاج رکھی ہوتی۔ چلی تو آئیں کہ میں شہزادی کے ساتھ دن گزاردوں گی اب کھیتو جواری کی روٹی اور روئیو چچا کی جان کو' تو جناب یوں ہمارا استقبال ہوا دستر خان پر تو اللہ کا دیا سب کچھ تھا۔مگر آغا چچا کی زبان کے چٹخارے کی بات ہی کچھ اور تھی۔

میں اکثر اپنے مضامین سنایا کرتی تھی ایک بار میرا ایک مضمون سن کر بولے''تیرے باوا نے زرز مین تو کچھ نہ چھوڑی یہ اچھا کیا کہ اپنی تحریریں چھوڑ گیا کہ لے بیٹی اپنے نام سے پڑھ پڑھ کر سناتی جا اور چھپواتی رہ'' حوصلہ بڑھانے کا یہ ان کا اپنا ایک انداز تھا۔

آغا صاحب جیسے خندہ رو اور شگفتہ مزاج بوڑھے کم ہی دیکھنے میں آئے بیٹی داماد ہندوستان سے باہر تھے۔آغا چچا ان سے ملنے گئے تو ادھر ہی کے ہو رہے۔ دکن کی ایک کہاوت ہے''چیل اڑی تو بھینس اڑی'' لیکن اکثر چیل نہ بھی اڑے تو بہر حال بھینس اڑ جاتی ہے کچھ ایسا ہی معاملہ آغا حیدر حسن صاحب کے ساتھ پیش آیا یہ افواہ بڑے یقین کے ساتھ اڑ گئی کہ آغا صاحب نے ایک جرمن شہزادی سے نکاح کر لیا۔اب تصدیق کیسے ہو....!

خدا خدا کر کے آغا چچا واپس آئے اور میں ملنے گئی

دیکھتے ہی بولے ''اب چچا یاد آیا'' میں نے بھی شکایتاً کہا آپ سے بھی تو اتنا نہیں ہوا کہ بھتیجی کو آنے کی اطلاع کرا دیتے غرض شکوے شکایت ختم ہوئے تو میں نے پوچھا ''سنا ہے آپ نے نکاح کر لیا'' گر بیگم تو کہیں دکھائی نہیں دیں۔ بے حد سنجیدہ صورت بنا کر بولے ''بیٹا چھوڑ آیا'' ان کی جگہ کوئی ایسی من گھڑت باتیں اپنے متعلق سنتا تو اس تہمت پر چلا اٹھتا مگر آغا صاحب کے لیے مضحکہ خیز بات بن کر رہ گئی بلکہ ایک لطیفہ ان کے ہاتھ آ گیا۔

گود میں کھیلی لڑکیاں بڑھیا گئیں تربیت یافتہ جوان بزرگوں کی صف میں شامل ہو گئے خود آغا صاحب کے چہرے پر سفید داڑھی لہرانے لگی لیکن نہ ان کے لہجے کے شرارت میں فرق آیا نہ طبیعت کی شوخی میں باتوں میں چہل مرتے دم تک رہی۔ دل کے مرض نے ادھ مرا کر دیا تھا۔ عزیزوں اور ملازموں سے تیمار داری کے روادارانہ تھے احتیاط اور پرہیز کے نام سے چڑ تھی۔ آخر ڈاکٹر سے شکایت کی گئی کہ صاحب کسی کی نہیں سنتے۔ ڈاکٹر نے ڈراتے ہوئے کہا آپ کو ارام کی ضرورت ہے دل کی حالت اطمینان بخش نہیں ہے آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ دل کا بہت چھوٹا حصہ باقی رہ گیا ہے۔ جو کام کر رہا ہے اس پر زیادہ بار نہیں پڑھنا چاہیے ڈاکٹر کی ہدایت پر عمل کیجئے۔ جب ڈاکٹر بات ختم کر چکا تو ہنس کر بولے'' عجیب بات بتائی آپ نے ساٹھ برس سے اوپر ہونے کو آئے کہ میں دونوں ہاتھوں سے دل لٹا رہا ہوں اور تم کہتے ہو اب بھی کچھ حصہ باقی رہ گیا!! ڈاکٹر بے اختیار ہنس پڑا اور کہنے لگا آغا صاحب آپ سے کوئی نہیں جیت سکتا! لیکن یہ ہنسے ہنسانے والا شوخ مزاج بوڑھا جو ہر محفل میں قہقہے بانٹا کرتا تھا اپنی لٹی ہوئی دلی کے غموں کو پہلوں میں سمیٹے 5 ستمبر 1976ء کو ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گیا۔

ان کے ایک مضامین کا مجموعہ ''پس پردہ'' یادگار ہے اور کئی مضامین مختلف رسائل میں بکھرے پڑے ہیں کچھ ان کے نادر کتب خانے کی کتابوں کے حاشیوں پر یادداشتوں کی صورت میں محفوظ ہیں۔ بچوں کی کہانیاں اور مختلف عنوانات پر خود آغا چچا کی زبانی کئی مضامین آل انڈیا ریڈیو کے پاس موجود ہیں کاش یہ تمام تحریریں چھپ جائیں ورنہ اب پرانی دلی کا کوئی آغا حیدر حسن جیسا داستان گو تو میری نظر سے نہیں گزرا۔

آغا چچا کے داماد میر معظم حسین صاحب نے آغا چچا کے رہائشی مکان کو میوزیم کی شکل دے دی ہے مختلف کمروں میں ان کے جمع کیے ہوئے ذخیرے کو بڑے سلیقے سے الماریوں میں سجا دیا ہے کتب خانے کو نئی ترتیب کے ساتھ ایسی صورت پیدا کر دی ہے کہ تحقیقی کام کرنے والوں کو استفادہ کرنے کا موقع ملے۔ کتب خانے سے متصل وسیع ہال بنایا ہے۔ جہاں آرام سے بیٹھ کر کام کیا جا سکتا ہے۔ کتب خانے کے علاوہ پرانے لباس، مخطوطات اور نایاب خطوط اور آغا چچا کی کچھ تحریروں کے مسودے بھی رکھے گئے ہیں اور بھی بہت کچھ ہے۔ جو دلی کی پرانی تہذیب کا پتہ دیتے ہیں۔

معظم بھائی کی یہ لگن بلا وجہ نہیں ''وہ آغا'' کے لاڈلے شاگرد اور اکلوتے داماد ہیں۔ ان دونوں کا یہ رشتہ قابل رشک بھی تھا اور قابل فخر بھی۔ معظم بھائی بڑی خوبیوں کے انسان ہیں بے حد مہذب شائستہ اور با اخلاق، ساری زندگی علم کی خدمت کی اور آج بھی وہ نچلے نہیں بیٹھتے سماج کے کمزور طبقے کو اونچا اٹھانے میں لگے ہوئے ہیں۔ ان کی گفتگو نشست برخاست ان قدروں کی نشاندہی کرتی ہے جو ان کو اپنے بزرگوں سے ورثے میں ملیں ہیں۔

دیکھئے مضمون ختم ہو رہا ہے اور مجھے آغا چچا کی وہ بات یاد آ رہی ہے جو ابا پر لکھنے میرے ایک مضمون کو سن کر کہی تھی انہوں نے کہا تھا ''بیٹا جی چاہتا ہے کل کا مرتا آج ہی مر جاؤں اور تو مجھ پر ایسا ہی مضمون لکھے'' میں نے گھبرا کر کہا بھئی ایسی بات زبان سے نہ نکالئے اور یہ بھی تو سوچئے کہ آپ کے بعد مضمون لکھا بھی گیا تو سناؤں گی کسے؟۔ اور آج مضمون لکھ دیا ہے۔ تو سوچ رہی ہوں یہ کیسی مجبوری ہے! کاش ان کو سنا سکتی۔

اشرف رفیع

مضمون

دکنی ادب اور آغا حیدر حسن

بیسویں صدی کے اوائل ہی سے ریاست حیدرآباد دکن میں، دکنی ادب پاروں کی تلاش وتحقیق کا نام شروع ہوگیا تھا۔ عبدالجبار ملکاپوری، ڈاکٹر زور، پروفیسر عبدالقادر سروری، پروفیسر سید محمد، پروفیسر عبدالمجید صدیقی، اکبرالدین صدیقی، سعادت علی رضوی، عمر یافعی، نصیرالدین ہاشمی وغیرہ نے نظم ونثر میں دکنی کے مخطوطات کی باز یافت کر کے انہیں مرتب اور مدون کیا۔ سلسلہ یوسفیہ، سلسلہ اشاعت دکنی اور ادارۂ ادبیات اردو کی طرف سے بیشتر کتابوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ ان کے بعد کی صف میں ڈاکٹر حفیظ قتیل، پروفیسر مسعود حسین خان، پروفیسر سیدہ جعفر، پرور فیسر عمر خان، ڈاکٹر حسینی شاہد، ڈاکٹر بدیع حسینی، پروفیسر ابوالنصر محمد خالدی، مبارزالدین رفعت، محمد بن عمر اور سخاوت مرزا وغیرہ نے کئی اہم تحقیقی کارنامے انجام دیئے۔ یہ وہ نام ہیں جن کا تعلق کسی نہ کسی طرح سرزمین دکن سے رہا ہے لیکن چند نام ایسے بھی ہیں جو ایک عمر گزرنے کے بعد دکن آئے اور دکنی زبان وادب سے دلچسپی لی۔ دکنی شہ پاروں کی تلاش، طباعت اور اشاعت کا کام انجام دیا۔ ان میں سے پہلا نام مولوی عبدالحق بابائے اردو کا آتا ہے۔ ان ہی کے ہم عصروں میں دوسرا اگر اہم نام آغا حیدر حسن مرزا کا آتا ہے۔ مولوی عبدالحق کے ساتھ ایک انجمن تھی انہوں نے انفرادی او راجتماعی طور پر دکنی شہ پاروں کو منظر عام پر لانے کے لیے انجمن کے سہ ماہی رسالے اردو اور انجمن ترقی اردو کا سہارا لیا۔ آغا حیدر حسن نے یہ کام تن تنہا انجام دیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آغا صاحب کا کام کمیت کے لحاظ سے عبدالحق کے مقابلے میں زیادہ وسیع نہیں لیکن کیفیت کے اعتبار سے مولوی عبدالحق کے کاموں سے زیادہ مستند اور معتبر ہے۔

آغا صاحب کا نام آتا ہے تو عموماً ان کی قلعہ معلیٰ کی زبان کی طرف خیال جاتا ہے جس کے عوام وخواص، طلباء واساتذہ سبھی شائق تھے۔ یہ بھی ان کی شخصیت کا ایک پہلو ضرور تھا اس کے علاوہ ان کی شخصیت کے کچھ اور بھی پہلو تھے۔ ان میں سے ہر پہلو اپنی جگہ تابناک تھا وہ ایک داستان گو تھے قطب شاہی، مغلیہ اور آصف جاہی دور کی تاریخ انہیں ازبر تھی۔ دلی اور دکن کے چپے چپے سے واقف تھے۔ ان کی گلیوں میں پرورش پائی ہوئی کہانیاں واقعات، حالات، حادثات اور خوش بیانیوں پر گہری نظر تھی کئی زبانیں جانتے تھے۔ عربی، فارسی، ترکی، ہندی اور سنسکرت سے خوب واقف تھے۔ شعر وادب تنقید وتحقیق ان کی جو لانگاہ تھی۔ سلاطین مغلیہ سے ان کا خاندانی تعلق تھا۔ گویا وہ حیدرآباد میں مغلیہ تاریخ وتہذیب کی آخری نشانی تھے ان کے اجداد صاحب سیف وقلم تھے اور قرطاس وقلم کے دھنی علمی ادبی اور تہذیبی وتاریخی نوادرات کے اچھے پارکھ تھے ان کے کتب خانے میں اردو، ہندی، سنسکرت، عربی، فارسی اور ترکی و دکنی کے مطبوعہ غیر مطبوعہ رسائل ملفوظات کاغذات اور کتابوں کا عمدہ ذخیرہ موجود تھا ان کے میوزیم میں غیر مطبوعہ اور مطبوعہ نادر کتابوں پر مبنی سرمایہ آج بھی محفوظ ہے۔

آغا حیدر حسن مرزا 14/ اگست 1893ء آغا صفدر حسن مرزا کے گھر مصطفیٰ خان کی حویلی دلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ اعلیٰ تعلیم کے لیے علی گڑھ گئے۔ علی برادران، حکیم اجمل خان اور گاندھی جی کے ساتھ تحریک خلافت میں حصہ لیا۔ اسی پاداش میں علی گڑھ اور پھر دلی چھوڑنا پڑا۔ سر راس مسعود کے

مشورے پر حیدرآباد آئے۔ ابتداء میں پولیس میں نوکری کی پھر نظام کالج میں اردو کے پروفیسر ہوئے۔ ان کے دلچسپ طریقہ تدریس سے طلباء بہت متاثر ہوتے تھے۔ ان کی کلاس انتظار رہتا تاھ۔ دیگر مضامین کے طلباء بھی ان کی کلاس میں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ پہلے پہلے A.C. گارڈز میں صدر منزل میں رہتے تھے وہاں سے بنجارہ ہلز حیدرآباد میں اپنا خوب صورت مکان حیدر منزل تعمیر کیا اور وہاں منتقل ہو گئے مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت (وزیر آعظم) سے گہرے روابط تھے۔ سالار جنگ سوم ان کی بڑی قدر کرتے تھے۔ پرنس معظم جاہ اور راجا دھن راج گیر جی سے خوب چھنتی تھی پرنسس درشہوار اور پرنس اسریٰ کو اردو پڑھانے پر مامور تھے۔ وہ یا تو صدر اجلاس ہوتے یا مہمان خصوصی۔ سامعین کو بس یہ انتظار ہوتا تھا کہ آغا صاحب کب مخاطب کریں گے جب وہ بولنے مائیک پر آتے تو یہ حال ہوتا تھا کہ بس وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ دہلوی زبان، محاورے اور ضرب الامثال وغیرہ سے رچی بسی تقریر، طنز کا نام نہیں مزاح سے بھری گفتگو افسردہ دل کو بھی شگفتہ کردے۔ فارسی زبان و ادب سے اچھی طرح واقف اور عربی سے ناواقف نہیں۔ ایسی مرنجان مرنج ہستی کا جب 5/نومبر 1976ء کو انتقال ہوا تو ایک عرصے تک حیدرآباد کی علمی ادبی محفلیں مشاعرے اور جلسے گویا سنسان ہو گئے۔ درگاہ یوسفین نامپلی حیدرآباد کے خط صالحین میں دلی کا یہ طوطیٰ ہزار داستان محوخواب ہے۔

آغا صاحب صرف تقریر کے آدمی نہیں تھے تحریر کے بھی دھنی تھے ان کے مضامین مختلف ادبی رسائل، جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ یہ سارے مضامین بکھرے پڑے تھے۔ پس پردہ، آغا صاحب کی پہلی کتاب ہے جو 1926ء میں مطبع مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے شائع ہوئی۔ اس میں پندرہ مضامین شامل ہیں یہ سارے مضامین دلی کی سیاسی، سماجی زندگی، تاریخ، تہذیب، تعمیر رسم و رواج، لباس زیورات بازار، دربار اور محلات کے دیدہ شنیدہ واقعات ان کی ان کہی حقیقتوں پر مبنی ہیں یہ مضامین کیا ہیں مجموعہ ہے مختلف نثری اصناف کا جس میں افسانہ نگاری کا سحر بھی ہے، خاکہ نگاری کا رنگ روپ، انشا پردازی کی دل کشی، ڈرامائی کیفیت بھی اور داستانوی انداز بھی۔ اور یہ سب کچھ دلی کی بیگماتی زبان کے چٹخارے کے ساتھ لطف دے جاتے ہیں۔ غدر کی کہانی کپڑے والی افصل النساء کی زبانی، اور دیگر کئی مضامین میں غدر کے دلدوز واقعات پیش کیے گئے ہیں۔ یہ مضامین کتابی شکل میں آنے سے قبل حضرت خواجہ حسن نظامی کی نظروں سے گزرے تو انہوں نے آغا صاحب کو ایک خط مورخہ 22/شوال 1339ھ م 29/ جون 1921ء میں لکھا ''تم الفاظ میں عورتوں کی زبان کا ایسا ہو بہو نقشہ اتار کر دکھادیئے ہو کہ آج تک کسی لکھنے والے سے نہ بن پڑا''۔

''ندرت زبان'' آغا حیدر حسن کی دوسری کتاب ہے جسے ان کی لائق صاحبزادی مہر النساء معظم حسین نے دسمبر 1996ء میں مرتب کر کے آغا حیدر حسن ریسرچ سنٹر، حیدرآباد سے شائع کیا۔ اس کتاب کو چھ حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں میر معظم حسین کا پیش لفظ ہے جس میں آغا صاحب کی زندگی کے کچھ واقعات پر روشنی پڑتی ہے اور اس کے بعد آغا حیدر حسن مرزا کا شجر نسب دیا گیا ہے اس کے بعد چھ مختلف نوعیت کی کتابوں پر تبصرے پیش لفظ اور مقدمے شامل ہیں دوسرا حصہ شخصیات پر ہے، بیگم نیڈو، پر لکھا مضمون، پس پردہ میں بھی شامل ہے یہ مضامین، انشاء پردازی اور خاکہ نگاری کی شان لیے ہوئے ہیں۔ تیسرے حصے میں تحقیقی مضامین اور تبصرے شامل ہیں۔ چوتھے اور پانچویں حصے میں

بالترتیب سیر وسیاحت اور مضامین (انشائیے) ہیں آخری اور چھٹے حصے میں بچوں کے لیے لکھے مضامین اور کہانیاں ہیں یہاں۔ہمیں تیسرے حصے کے تحقیق مضامین اور تبصروں پر اپنی توجہ مرکوز کرنی ہے جس میں دکنی سے متعلق سات مضامین شامل ہے۔

پہلا مضمون ''ظفر نامہ عشق'' ہے۔اس مضمون کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے پہلے حصے میں قلمی نسخے ''ظفر نامہ عشق'' کا مختصر سا تعارف ہے جو آغا صاحب کے کتب خانے میں ہے لیکن یہ ناقص الاول و آخر ہے۔ سنہ تصنیف بھی کہیں درج نہیں، آغا صاحب نے اندرونی شواہد خصوصاً زبان سے اندازہ لگایا ہے کہ یہ اورنگ زیب عالمگیر کے زمانے میں خاندیس میں لکھا گیا ہوگا۔سید ظفر وہیں کے صوفیا میں سے تھے جنہیں ملا شیخ احمد سے عقیدت تھی جو سید مظفر کے ہم نشینوں میں سے تھے۔آگے چل کر نسخے کے بابت لکھتے ہیں کہ اکثر جگہ غزل، رباعی، قطعہ، وغیرہ بھی مثنوی میں آ گئے ہیں۔اس نسخے کا مسطر کہیں نوسطری ہے اور کہیں سترہ سطری۔آغا صاحب کے مجموعہ میں اشعار کی مجموعی تعداد پانچ ہزار چورانوے ہے۔نمونتاً مثنوی کے کچھ اشعار بھی لکھ دیئے ہیں جو دوسرے حصے میں شامل ہیں مثنوی کے محاسن میں منظر نگاری، تشبیہ، استعارے، زبان و بیان کی خوبیاں بیان کرتے ہوئے کچھ اشعار بھی دیئے ہیں۔

دوسرا مضمون اشرف کی ''نوسر ہار'' ہے۔اپنے مضمون میں آغا صاحب نے کہیں نہیں لکھا کہ ان کے پیش نظر یہ نسخہ کس کتب خانے کا ہے۔اب تک اس کے صرف دو ہی نسخے ملتے ہیں ایک ادارۂ ادبیات اردو، حیدرآباد میں ہے اور دوسرا انجمن ترقی اردو ہند کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔غالباً آغا صاحب کے پیش نظر ادارۂ ادبیات اردو کا نسخہ رہا ہوگا۔اس نسخہ میں جو غلطیاں ہیں وہی غلطیاں اس مضمون میں بھی در آئی ہیں مثلاً ادارہ کے نسخے میں نویں باب کی جگہ سہواً باب دہم لکھا ملتا ہے۔آغا صاحب نے اپنے مضمون میں نوسر ہار کی تفصیل بتلاتے ہوئے نویں باب کی جگہ باب دہم لکھ دیا ہے چوں کہ اس مثنوی میں نو ابواب ہیں اس لیے اشرف نے اس مثنوی کا نام ''نوسر ہار'' رکھا ہوگا۔

نوسر ہار واقعہ کربلا پر لکھی اردو کی سب سے پہلی مثنوی ہے۔اس کا سند تصنیف 1503ء ہے مثنوی کے خاتمے پر ایک شعر ہے جس سے تاریخ تصنیف کا پتہ چلتا ہے۔

بازاں جیوں کی تاریخ سال بعد از ہجرت بنی حال
نوسو ہوئے نو پہ دکھ لکھیا اشرف تو

ترقیمہ اس طرح ہے سے دیگر تفصیلات سامنے آتی ہیں۔

''تمت تمام شد کتاب نوسر ہار کہ از گفتار شیخ اشرف مرحوم، کاتبہ فقیر الحقیر تراب اقدام علماء وفضلاء قاضی محمد جعفر بن غفراں پناہ قاضی محمد حسین۔ قاضی پرگنہ چاندور، در یک ماہ۔ایں مقتل نامہ امام حسن وحسین نوشتہ شد'' (ص،169) یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ یہ 1735 اشعار کی مثنوی کاتب قاضی محمد جعفر ابن قاضی محمد حسین، قاضی پرگنہ چاندور نے صرف ایک مہینے میں نقل کی ہے اس مہینے کے ترقیمے میں اشرف کا پورا نام شیخ اشرف لکھا ملتا ہے مولوی نصیر الدین ہاشمی نے بھی نوسر ہار کے مصنف کا نام شیخ اشرف ہی لکھا ہے۔

ادارہ کا مخطوطہ مکمل ہے اور جس نسخے کی تفصیل آغا صاحب نے دی ہے وہ بھی مکمل ہے۔آغا صاحب نے مثنوی کا کوئی فنی تجزیہ یا تنقید نہیں کی ہے۔صرف ابواب واری تفصیلات دی ہیں۔شاید یہاں ان کا مقصد نسخے کی اہمیت سے محققین کو واقف

کروانا رہا ہوگا۔

''سلطان عبد اللہ قطب شاہ سابع والیٔ گولکنڈہ کے گیت'' کے عنوان سے تیسرا مضمون ہے جس سے کئی اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آغا صاحب کے کتب خانے اور نوادرات کے ذخیرے میں عبداللہ قطب شاہ کی دو قلمی تصویریں ہیں جن کی مدد سے آغا صاحب نے عبد اللہ قطب شاہ کے لباس زیورات، ان کے رنگ اور بناوٹ کی تفصیل دی ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کا دور حکومت زبان و ادب کا سنہرا دور تھا۔ اس کے دربار میں اردو اور فارسی کے بڑے بڑے شعراء، ادباء، اور علماء موجود تھے۔ عبد اللہ قطب شاہ خود بھی فارسی اور اردو میں شعر کہتا تھا۔ عبد اللہ قطب شاہ کے کلام کا ایک نامکمل دیوان کتب خانے سالار جنگ میں ہے۔ پروفیسر سید محمد نے اسے مرتب کر کے مجلس اشاعت دکنی مخطوطات کے زیر اہتمام شائع کیا اس کا دوسرا ایڈیشن نظر ثانی کے بعد پروفیسر محمد علی اثر نے ڈاکٹر عطاء اللہ خان کے اشتراک سے شائع کیا ہے۔ آغا صاحب کے اس مضمون سے پتہ چلتا ہے کہ عبد اللہ قطب شاہ نے گیت بھی لکھے تھے ان گیتوں کی ایک قلمی بیاض نواب نصیر الدین بہادر فرزند نواب رحیم یار جنگ کی یہاں تھی اب آغا صاحب کے کتب خانے میں ہے۔ اس بیاض پر ''درویش محمد بندہ درگاہ'' 1095ھ کی مہر لگی ہوئی ہے۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کی کتاب نورس کی طرح یہ گیت بھی راگ راگنیوں میں لکھے گئے ہیں۔ ان راگ، راگنیوں کو عبداللہ قطب شاہ نے ''نقش'' سے تعبیر کیا ہے۔ ''نقش'' کی وضاحت کرتے ہوئے آغا صاحب لکھتے ہیں ''نقش یا گیت کے پہلے دو بول'' عقدہ'' کہلائے جاتے ہیں۔ اس کے بعد دوہوں سے ملتے ہوئے دو دو مصرعے ہیں ان کو بین کہا ہے یہ بین ہر نقش میں ہیں۔ کسی میں دو، کسی میں تین، کسی میں چار کسی میں پانچ۔ آخر کا بند بھی دو مصرع کا ہوتا ہے اور دوہے سے ملتا ہوا۔ اس کو ''ابھوگ'' کہتے ہیں۔ یہ ایسا ہی نقش ہیں، جیسے غزل میں مقطع، کیوں کہ ہر ایک ابھوگ میں سلطان عبد اللہ کا تخلص آتا ہے۔ (ص، 73، 147) بین کے بارے میں آغا صاحب کہتے ہیں کہ یہ ''انترہ'' ہے اور ابھوگ استانی (استھائی) کے مقام پر ہے۔ ان گیتوں میں عبداللہ قطب شاہ نے تخلص کہیں سلطان عبداللہ، کسی میں شاہ عبداللہ، عبداللہ شاہ بھی استعمال کیا ہے۔ ان دس گیتوں کو آغا حیدر حسن مرزا نے اپنی مملوکہ بیاض سے نقل کیا ہے۔ جن میں سے پانچ گیت کیدارا میں ہیں باقی رام گیری، پھری گوری، کنٹرامنٹ اور کلیان میں ہیں۔ اس مضمون سے یہ بھی اطلاع ملتی ہے کہ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے نورس نامہ کا بھی ایک نسخہ آغا صاحب کے کتب خانے میں موجود تھا ڈاکٹر نذیر احمد نے نورس کی ترتیب کے دوران جن دس مخطوطوں کا حوالہ دیا ہے، ان میں آغا حیدر حسن مرزا کے نسخہ کا بھی حوالہ ہے۔ لیکن دکنی لغت و تذکرۂ مخطوطات (تالیف پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا مرتبہ پروفیسر مغنی تبسم) کی فہرست میں (نورس) کے نسخے کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

حسن بیگ نے ملا واعظ حسین کاشفی کی روضۃ الشہداء کا دکنی نثر میں ترجمہ کیا تھا۔ حسن بیگ، شاہجہاں آباد سے اورنگ زیب کے زمانے میں دکن آیا تھا اس نے اپنے دکنی ترجمہ کا نام ''وسیلۃ النجات'' رکھا۔ آغا صاحب لکھتے ہیں۔ وسیلۃ النجات کا دنیا میں صرف ایک ہی نسخہ ہے جو آغا صاحب کے کتب خانے کی زینت ہے۔ یہ نسخہ مصنف کے ہاتھ کا لکھا ہے۔ آغا صاحب نے اس نسخہ کی تاریخ تصنیف اور تاریخ کتابت نسخہ کے حوالے سے لکھی ہے کہ تاریخ تصنیف یا ترجمہ 1114ھ اور نسخہ کتابت چہارم ذی الحجہ 1115ھ ہے۔ گیارہ سطری یہ نسخہ نوسو چھ صفحات پر مشتمل ہے اور

نثر میں مصائب پر سب سے قدیم کتاب ہے۔ دکنی سے اپنی ناواقفیت کا اظہار کرتے ہوئے مترجم لکھتا ہے''حسن بیگ شاہ جہانوی'' منگیا کہ دکنی زبان سوں اقوال شہیداں کا بولے، ہر چند دکھنی زبان سوں واقف نہ تھا، وے ثواب کی طمع سوں یو کتاب بولیا ہور نام تو اس کا وسیلۃ النجات رکھا (ص184) وسیلۃ النجات ملی جلی نظم ونثر میں ہے لیکن جہاں تہاں نظم نگاری بھی کی ہے اور تخلص حسن استعمال کیا ہے۔اس کے دس ابواب ہیں۔آغا صاحب نے اپنے مضمون میں ابواب کی تفصیل میں لسانی وادبی خصوصیات پر مختصر مگر جامع گفتگو کی ہے۔

آغا حیدر حسن مرزا نہ صرف مغلیہ دور کی تاریخ تہذیب زبان بلکہ دکنی تہذیب وتاریخ کی بھی ایک جیتی جاگتی دستاویز تھے ان کے انشائیے۔سیر وسیاحت پر لکھے مضامین، تاریخی مقالے۔ بچوں کی کہانیاں غرض ان کے قلم سے نکلی ہوئی ہر تحریر میں دلی اور دکن کی تہذیبوں کا تال میل صاف نظر آتا ہے۔دکنی تہذیب پر اب تک کئی کتابیں اور مضامین منظر عام پر آچکے ہیں لیکن آغا صاحب کا مضمون''دکنی تہذیب وتمدن'' خاصے کی چیز ہے۔ یہ مضمون پہلی مرتبہ سب رس جنوری1961ء میں شائع ہوا تھا۔اس مضمون میں قطب شاہوں کی مختصر ترین تاریخ بیان کی گئی ہے بادشاہوں کے شعری سرمایہ کا مختصر سا تعارف ہے۔ابوالحسن تانا شاہ کا ذکر آتا ہے تو آغا صاحب کے قلم میں روانی آجاتی ہے۔تانا شاہ عبداللہ قطب شاہ کا داماد تھا وہ شاعر قلندر مزاج تھا۔اپنی نازک مزاجی کی وجہ سے بہت مشہور ہو گیا۔اس کی نازک مزاجی کے کئی قصے مشہور ہیں ان میں سے ایک جو بہت مشہور ہے اس کا ذکر آغا صاحب نے بھی کیا ہے''موت کا باعث بھی ایک گھوسن کا پاس سے گزرنا ہے دودھ دہی کی بو کی تاب نہ لاکر اس نے عزیز جان، جان آفرین کے سپرد کی''

قطب شاہی حکومت کی وسعتیں، عمارتیں، باغ، شفاخانے،عبادت خانے،عمارتوں کی حسن کاری استرکاری زنانی و مردانی لباس زیورات،رسومات،صنعتیں،وزراعت فن پارچہ بافی، طباخی،آداب محفل غرض کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جس کا ذکر نہ کیا گیا ہو۔محمد قلی قطب کے لباس کا ذکر آیا تو لکھا یہ لباس دکن سے شمالی ہند کے درباروں میں پہنچا اور بہادر شاہ ظفر تک یہی رہا۔قطب شاہی عہد میں دکنی تہذیب پر کام کرنے والے محققین کے لیے یہ مضمون بنیادی اہمیت کا حامل ہے۔

نصرتی،علی عادل شاہ ثانی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ اس نے غزلوں اور قصائد کے علاوہ تین مثنویاں تصنیف کی ہیں گلشن عشق(1657ء) علی نامہ(1665ء) اور تاریخ اسکندری(1672ء) نصرتی کی غزلیات کا مجموعہ،گلشن عشق اور علی نامے کا ایک ایک نسخہ آغا صاحب کے کتب خانے میں تھا مگر وہ اب نایاب ہے۔علی نامہ پر آغا صاحب کا مضمون ان کے مضامین کے مجموعہ''ندرت زبان''میں شامل ہے چالیس کے دہے میں یہ مضمون سب سے پہے نظام کالج کے میگزین میں شائع ہوا تھا جہاں وہ پروفیسر تھے۔1959ء میں نامور مورخ ومحقق پروفیسر عبد المجید صدیقی نے علی نامہ مرتب کیا جو مجلس اشاعت دکھنی مخطوطات کی جانب سے شائع ہوا۔آغا صاحب کا یہ مضمون صدیقی صاحب سے بہت پہلے شائع ہو چکا تھا''ندرت زبان'' میں علی نامہ نصرتی کے عنوان سے دو مضامین ہیں پہلے مضمون میں نصرتی کے حالات زندگی،گلشن عشق کا تعارف اور پھر علی نامہ کی تفصیلات ہیں جن میں علی عادل شاہ ثانی اور سیواجی کی معرکہ آرائیوں کا ذکر ہے۔ دوسرے حصے میں علی نامے کسے مختلف ابواب سے اشعار دیئے گئے ہیں۔

''پھول بن'' پر بھی آغا صاحب کا مضمون معلومات آفریں مضمون ہے۔حیدرآباد میں پھول بن کے تین نسخے تین مختلف کتب خانوں میں موجود ہیں۔ایک اورینٹل مین اسکرپٹ لائبریری اینڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں دوسرا سالار جنگ کے مشہور زمانہ کتب خانے میں محفوظ ہے۔تیسرا نسخہ خود آغا صاحب کے کتب خانے میں تھا۔ان تینوں نسخوں کی تین مختلف کیفیات ہیں۔اورینٹل مین اسکرپٹ لائبریری کے نسخے میں عنوانات نہیں ہیں مناقب خلفائے راشدین کا پورا حصہ غائب ہے۔سالار جنگ والا نسخہ ناقص الآخر ہے۔آغا صاحب کا نسخہ مکمل حالت میں تھا۔مگر اب یہ بھی علی نامہ کی طرح ان کے کتب خانے سے غائب ہو گیا ہے۔ اپنے مملوکہ نسخے کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''میری مملوکہ مثنوی میں کم و بیش گیارہ سطری ایک سو بیاسی صفحے ہیں جن کے اشعار کی مجموعی تعداد دو ہزار پانچ ہے جن میں سے پچاس اشعار جو بطور عنوانات استعمال ہوئے ہیں دوسری بحر میں ہیں۔یہ مثنوی بہت نادر ہے۔''(228-229)

نصرتی نے بھی اپنی مثنوی میں اسی طرح کے عنوانات قایم کیے ہیں۔تمام عنوانات کے اشعار پھول بن میں ایک ہی بحر اور قافیہ میں ہیں اگر انہیں یکجا کیا جائے تو ایک الگ منظوم قصہ بن سکتا ہے۔اپنے مملوکہ مخطوطے کے بارے میں تمام تفصیلات دیتے ہوئے مثنوی کے محاسن پر بھی روشنی ڈالی ہے۔پھول بن کی تاریخ تصنیف کے بارے میں مختلف قیاس آرائیاں ہوئی ہیں۔مولوی نصیرالدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں سنہ تصنیف 1066ھ دیا ہے پروفیسر سروری اور شیخ چاند نے 1076ھ بتایا ہے اور یہی تاریخ درست ہے کیوں کہ شیخ مظہرالدین ابن نشاطی نے ''داستان پھول بن'' کے آغاز میں صاف صاف تاریخ تصنیف لکھ دی ہے۔

صفا دار اس کے دیک ہر یک چمن میں
رکھیا ہوں نانوں اس کا پھول بن
اٹھا تاریخ تو لایا یہ گلزار
اگیارہ سوکوں کم تھے بیس پر چار
گیارہ سوکوں کم تے بیس پر چار

یعنی 1076ھ (م1665ء) سنہ تصنیف ہے۔

آغا صاحب کے مملوکہ مخطوطہ پھول بن میں جیسا کہ آغا صاحب نے بتایا ہے جملہ اشعار کی تعداد دو ہزار پانچ ہے لیکن مثنوی کے اختتام پر ان اشعار سے پتہ چلتا ہے کہ پھول بن جملہ 11744 اشعار پر مشتمل ہے مزید یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یکم رجب سے مثنوی کا لکھنا شروع ہوا تو رمضان کی عید یعنی یکم شوال کو اختتام پذیر ہوا۔وہ اشعار یہ ہیں۔

گنت ہیں اے سو یک بار بتیاں
ہے ستر سو یو دو بیس چار بتیاں
کیا میں ابتداء یک ماہ رجب
کما سیست کوں انپڑیا عید کوں سب
یو پھول بن تین مہینے لگ لگایا
پنم کا چاند ہو پورا تو آیا

آغا صاحب کے پاس 1261 اشعار کیسے زیادہ شامل ہو گئے کچھ پتہ نہیں چلتا۔

اپنے نسخے کے بارے میں تمام تفصیلات دینے کے بعد آغا صاحب نے مثنوی کے محاسن پر اظہار خیال کیا ہے۔یہ بھی اطلاع دی ہے کہ ''ان قدیم مثنویوں کا ذکر اپنی تاریخ ادب اردو میں موقع موقع سے کیا ہے (236) تلاش بسیار کے باوجود مذکورہ تاریخ ادب اردو دستیاب نہیں ہو سکی۔اگر یہ تاریخ مل جاتی تو دکن

ادب کے بارے میں کئی معلومات سامنے آسکتی تھیں۔

''حیدرآباد کی سیر'' آغا حیدر حسن مرزا کے مختلف مضامین کا ایک اور مجموعہ ہے جسے شہزادی مہرالنساء معظم حسین نے مرتب کر کے مارچ1997ء میں آغا حیدر حسن ریسرچ سنٹر سے شائع کیا ہے اس مجموعہ میں آغا صاحب کے 37 مضامین ہیں۔ان مضامین میں زیادہ تر مضامین حیدرآباد کے تاریخی، تہذیبی گوشوں اور مشہور محلوں پر ہیں، حیدرآباد کی عید تہوار، پتنگ بازی، رمضان کی حیدرآباد میں رونقیں، مہاراجہ سرکشن پرشاد، حضور نظام آصف سابع کی ایک سالگرہ اور دیگر شخصیتوں پر ہیں۔غالب کی دلی ایک ڈرامہ، جنگ کی باتیں، آخر میں بچوں سے باتیں اور ایک کہانی بعنوان کتے کی کہانی ہے۔ان تمام مضامین میں حیدرآباد کی تہذیب کے ایک ایک پہلو پر کئی کئی صفحے لکھ دیئے ہیں جس سے ان کی حیدرآباد اور حیدرآبادیوں سے دلچسپی شیفتگی کا پتہ چلتا ہے۔ان تمام مضامین کے درمیان دو مضامین اپنی جداگانہ اہمیت اور انفرادیت رکھتے ہیں۔ان دونوں مضامین میں سے ایک کا تعلق ماضی قریب کے دکنی شاعر نذیر دہقانی پر ہے۔یہ مضمون دہقانی کے مجموعے کلام پر تبصرہ ہے جو دکن کی دہقانی زبان میں شاعری کیا کرتے تھے۔آج کل دکن کے جو مزاحیہ شاعر دکنی میں شاعری کرتے ہیں ان کے پاس مزاح کا پہلو زیادہ ہوتا ہے جس میں پھکڑ پن بھی شامل ہوجاتا ہے یہ شعراء بھی اپنے طنزیہ کلام سے سماج کی ناہمواریوں پر خوب غبار نکالتے ہیں دہقانی حیدرآباد کے وہ شاعر ہیں جنہوں نے نہایت سنجیدہ موضوعات پر اپنی دہقانی زبان میں موضوعاتی نظمیں، غزلیں، قطعات، رباعیات اور سہرے لکھے ہیں ایسے گونا گوں موضوعات بعد میں سلیمان خطیب اور سرور ڈنڈا کے پاس ہی ملتے ہیں۔

اس کے بعد آغا صاحب کا مضمون دکنی مرثیہ گو شامل ہے۔اس موضوع پر چراغ علی اور ڈاکٹر رشید موسدوی کے تحقیقی مقالے بہت بعد میں منظر عام پر آئے ہیں۔آغا صاحب نے بھی حدیقۃ السلاطین اور ڈاکٹر زور وغیرہ کی طرح مرثیہ گوئی میں دکن کی اولیت کا اقرار کیا ہے''اشرف بیابانی کی نوسرہار(9-9ھ م1503) سے لے کر وجہی، محمد قلی قطب شاہ، عبداللہ قطب شاہ، غواصی، شاہی، کاظم، مرزا، قادر، نوری اور ہاشمی تک کئی نام ایسے ہیں جنہوں نے مرثیہ نگاری میں نام کمال ہے۔آغا صاحب نے جن مرثیہ گو شاعروں کا ذکر کیا ہے ان میں دکنی دور کے ملک خوشنود، دایاغی، غواصی، عشقی، ظہور، باقر جلالی، محمد صادق، محشر، میر حمزا، میر حیدری اور احمد خان احمدی کے نام آئے ہیں اور ان کے مرثیوں سے نمونے کے اشعار دیئے ہیں۔

مرزا باقر جلالی کے ایک مرثیے سے ایک مقطع نمونتاً دیا ہے اور بتایا ہے کہ جلالی کے بہت سارے مرثیے ان کے کتب خانے میں ہیں۔حیدرآباد کی سیر(ص269)

شاہی کا ایک مرثیہ جو راگ بھوپالی میں لکھا ہے اس کے تین ابیات لکھتے ہوئے یہ بھی اطلاع دی کہ شاہی کے مرثیے بھی ان کے کتب خانے میں متعدد ہیں۔(حیدرآباد کی سیر،269)

دکنی اردو کی لغت تیار کرنے کی ایک کوشش سید شعار احمد ہاشمی نے کی تھی۔یہ لغت دکنی لغت کے نام سے 1950ء سے قبل مکتبہ، ابراہمیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی تھی اس میں دکنی تصانیف کے الفاظ کے ساتھ دکنی بول چال کے الفاظ بھی شامل کیے گئے ہیں۔اس سے قبل ایک ابتدائی کوشش ''دکن کی زبان'' کے نام سے حیدرآباد کے مشہور تاریخ گو عارف ابوالعلائی نے 1354ھ م(36-1935) میں کی تھی۔یہ لغت مطبع ادبیہ حیدرآباد سے شائع ہوئی جس میں دکنی الفاظ محاورے، روزمرہ وغیرہ کے معنی دیئے گئے

ہیں 1929ء میں پروفیسر مسعود حسین خان کی لغت منظر عام پر آئی۔یہ بڑی تختی کے 381 صفحات پر مشتمل ہے مارچ (1970ء) کرناٹک کے سید ابوتراب خطائی ضامن نے بھی دکنی اردو لغت ترتیب دی تھی خطائی کی لغت پانچ ہزار الفاظ کا احاطہ کرتی ہے۔ڈاکٹر جمیل جالبی نے دسمبر 1973ء میں قدیم اردو لغت ترتیب دی یہ تقریباً پندرہ ہزار الفاظ کی لغت ہے۔پروفیسر سیدہ جعفر کی لغت بہت بعد میں منظر عام پر آئی ہے۔آغا حیدر حسن مرزا نے بھی ایک لغت مرتب کی تھی اس کی تاریخ وغیرہ کا کچھ پتہ نہیں چلتا اتنا اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ انہوں نے 1936 سے قبل ہی یہ لغت مدون کی ہوگی کیوں کہ ان کی لغت میں کسی اور کی لغت سے استفادہ کا ثبوت نہیں ملتا۔اپنی لغت کی تدوین میں انہوں نے (38) دکنی مطبوعات اور مخطوطات سے اندراجات لیے ہیں ان کے علاوہ دکن میں بولی جانے والی زبان،الفاظ،محاورے اور ضرب الامثال کو اپنی لغت میں شامل کیا ہے اس لغت میں تقریباً 8 ہزار الفاظ ومحاورے وغیرہ شامل ہیں اکثر الفاظ کے جتنے ممکنہ معنی ومطالب ہوسکتے ہیں وہ سب لکھ دیئے ہیں۔آغا صاحب تھے تو دہلوی مگر دکنی زبان وادب سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔انہوں نے الفاظ اور محاورہ کے معنی بالتحقیق دیئے ہیں۔الفاظ ومحاوروں کی تشریح کی ہے اور محل استعمال بھی بتایا ان کی تہذیبی معیار بندی بھی کی ہے۔دکنی میں دیگر زبانوں سے لیے گئے دخیل الفاظ اور ان کی کیفیت پر بھی روشنی ڈالی ہے دہلوی اور دکنی محاوروں کے مابین فرق وامتیاز کی بھی وضاحت کی ہے۔غیر دکنی الفاظ کی شمولیت کے بارے میں آغا حیدر حسن مرزا نے جواز یہ پیش کیا ہے۔

''شمالی ہند کے ملکی زبان میں تصنیف کرنے والوں نے کہیں اپنی زبان کو دکنی سے منسوب کیا ہے اور کہیں ہندی سے اس میں ایک آدھ جگہ کتابوں کا حوالہ بھی دیا ہے۔میں نے اس کے الفاظ کو حالاں کہ وہ دکنی نہیں دکنی لغت میں اس لیے جگہ دے دی ہے کہ شمالی ہند کی قدیم اردو کی تصانیف کم ہیں.....اس لیے ان کے کتابوں کے الفاظ کو بھی مجبوراً دکنی لغت میں جگہ دے دی ہے۔(دکنی لغت وتذکرہ دکنی مخطوطات مرتبہ پروفیسر مغنی تبسم،ص435)

آغا صاحب کے مکان حیدر منزل بنجارہ ہلز میں نوادرات،مخطوطات،مطبوعہ اردو اور فارسی کتابوں کا ذخیرہ ایک چھوٹے سے بیش قیمت میوزیم میں تھا۔ان کے مملوکہ مخطوطات ان کی وفات کے بعد پیرس منتقل ہو چکے ہیں آغا صاحب نے اپنے مخطوطات کی ایک وضاحتی فہرست بھی مرتب کی تھی اس مرتب فہرست سے مرتب دکنی لغت وتذکرہ دکنی مخطوطات پروفیسر مغنی تبسم کو صرف 38 مخطوطات کے تذکرے دستیاب ہوئے ہیں جن کے بارے میں مرتب نے بڑی جستجو اور محنت سے مزید معلومات حاصل کر کے انہیں ہر تذکرے کے ختم پر قوسین میں درج کر دیا ہے اور تذکرہ کو مزید کارآمد بنا دیا ہے۔

آغا حیدر حسن مرزا کے دکنی پر تحقیق کارناموں سے ہمارے سامنے تحقیق کی کئی راہیں کھل جاتی ہیں۔آغا صاحب کے کتب خانے سے دکنی زبان وادب پر تحقیق کرنے والوں نے بہت استفادہ کیا۔نہ صرف دکنی پر بلکہ حیدرآباد اور اطراف حیدرآباد کی تہذیب،تاریخ زبان وادب پر کام کرنے والوں کے لیے بھی ان کے کتب خانے میں کئی مطبوعہ،غیر مطبوعہ کتابیں فرامین امثلہ وغیرہ موجود ہیں۔آغا صاحب کی وفات کے بعد ان کے داماد میر معظم حسین صاحب اور صاحبزادی شہزادی مہرالنساء معظم حسین نے اس بیش قیمت سرمایہ کے حفاظت کی اور سنجیدہ محققین کے لیے کتب خانے کے دروازے کھلے رکھے ہیں۔

شاہد حسین زبیری

مضمون

آغا حیدر حسن مرزا کی برجستہ گوئی

میری تمام زندگی میں دو ہی ایسی شخصیات سے ملاقات ہوئی جو نہایت آسانی سے اپنی برجستہ گوئی میں ایسے جملے استعمال کر بیٹھتے جو شاید عام آدمی کے لیے اس دور میں مشکل ہوتے تھے اور شاید آج بھی مشکل ہیں۔ یہ لوگ اس قدر اعتماد سے ان جملوں کا استعمال کرتے کہ نہ ہی مخاطب کو برا لگتا اور نہ ہی آس پاس بیٹھے ہوئے سامعین کو۔ بلکہ سب لطف اندوز ہوتے۔ میری مراد آغا حیدر حسن مرزا اور بریگیڈیر میر توفیق علی سے ہے۔

میرا مقصد کسی حال میں بھی ان دونوں کا تقابل ہرگز نہیں ہے۔ آغا حیدر حسن مرزا کے انداز میں کوٹ کوٹ کر مشرقیت بھری ہوئی تھی۔ اس کے برخلاف بریگیڈیر توفیق کے اندازِ گفتگو پر مغربیت حاوی تھی اور وہ اپنی زبان اور اظہار میں نرے فوجی تھے۔

آغا صاحب کے پاس زبان اور اظہار کا ایک خاص انداز تھا اور خاص خوبی یہ تھی کہ شاید ہی کوئی ایسا شخص رہا ہو جو ان کے جملوں کی زد میں نہ آیا ہو۔ غیروں کی بات تو کجا انہوں نے اس معاملے میں نہ اپنی اولاد کو بخشا اور نہ خود کو۔

چلیے بات انہیں سے شروع کرتے ہیں۔ یہ اس دور کا ذکر ہے جب گھروں میں زنانے اور مردانے حصے الگ ہوا کرتے۔ لہٰذا بہت کم موقعے ایسے ہوتے جس میں دونوں ساتھ نظر آتے۔ جسے آج کی زبان میں ہم مکس گیدرنگ کہتے ہیں۔ آغا صاحب کے جس کسی سے تعلقات تھے وہ نہایت قریبی خاندانی تعلقات میں گردانے جاسکتے ہیں۔ کہیں جاتے اور پتہ چلتا کہ کچھ خواتین ساتھ جمع ہیں تو نہایت بے تکلفی سے وہاں پہنچ جاتے۔ اگر اس محفل میں کوئی نئی خاتون ہوں اور انہیں عجیب سا لگے تو موقع کو بھانپ لیتے اور فرماتے، ''بی بی کیوں پریشان ہو رہی ہو۔ یہ آغا حیدر حسن نہیں۔ یہ تو آپا حیدر حسن ہے۔''

یہ وار تو وہ تھا جو انہوں نے خود پر کیا تھا۔ دوسرا واقعہ بھی ملاحظہ ہو جس کی زد میں ان کے اپنے صاحبزادے آغا سر تاج حسن مرزا جو چاند پاشاہ بھی کہلاتے تھے آئے ہیں۔ کسی رشتہ دار نے آغا صاحب سے فرمایا، ''ماشاء اللہ اب چاند پاشاہ کی شادی ہو جانی چاہیے۔''

آغا صاحب برجستہ فرماتے ہیں، ''ائے بی نہ کسی پڑوسن سے شکایت ملی، نہ ہی گھر کی کسی ملازمہ نے شکایت کی۔ بھلا کس منہ سے رشتہ لے کر جاؤں۔''

جس دور میں آغا صاحب نظام کالج میں اردو کے پروفیسر ہوا کرتے تھے، کسی طالب علم نے جس کے پاس اردو مضمون نہیں تھا آغا صاحب سے دریافت کیا کہ میری بڑی خواہش ہے کہ میں اردو سیکھوں۔ مجھے کوئی ایسا طریقہ بتا دیجئے کہ آسانی سے جلد از جلد اردو سیکھ لوں۔ جواب میں فرمانے لگے، ''برخوردار یکطرفہ عشق کرنا شروع کر دو۔ جب فراق کی آگ میں جھلسو گے تو اردو خود بخود آجائے گی۔''

یہ اس دور کا ذکر ہے جس زمانے میں آغا صاحب بنجارہ ہلز منتقل نہیں ہوئے تھے اور یہ لکڑی کے پل پر اے سی گارڈس یعنی آفریکن کیولری گارڈس کے قریب رہائش پذیر تھے۔ لکڑی کے پل کی دوسری جانب محلّہ 'خیرت آباد' واقع ہے۔ ایک صاحب جنہیں

الف کا نام بھالہ بھی نہیں آتا تھا، ہمیشہ کوشش میں لگے رہتے تھے کہ ان کا شمار پڑھے لکھے اردو دانوں میں ہوجائے۔ کسی نے جنابِ والا کے سامنے اقبال کی مشہور نظم 'مسجد قرطبہ' کی تعریف کردی۔ موصوف نے شاید یہ نام پہلی بار سنا تھا۔ سمجھے گویا کہ ان کے ہاتھ ایک بیش بہا خزانہ لگ گیا ہو۔ مگر بدقسمتی سے موصوف علم سے بالکل پیدل تھے۔ لہٰذا مسجد قرطبہ کو بھول گئے اور بڑی شان سے آغا صاحب کے سامنے اپنی اردو دانی کا سکہ جمانے کی غرض سے دریافت کیا، ''کیا آپ کی نظر سے اقبال کی مشہور نظم 'مسجد خیرت آباد' گزری ہے؟''

آغا صاحب نے بڑی سنجیدگی سے فرمایا، ''میاں میں مسجد اے سی گارڈس سے آگے نہیں بڑھا۔''

چلیے ان کے ان فقروں کا بھی ذکر ہوجائے جس میں انہوں نے ایہام سے کام لیا ہے۔

تعطیلات کے بعد کالج کا پہلا دن تھا۔ آغا صاحب سے سامنے بیٹھی ہوئی لڑکیوں نے فرمایا، ''سر! آج پہلا دن ہے چھوڑ دیجیے۔''

آغا صاحب نے نہایت سنجیدگی سے جواب دیا، ''بھلا پہلے دن بھی کوئی چھوڑتا ہے۔''

آغا حیدر حسن مرزا کے داماد نواب میر معظم حسین جب پیرس بحیثیت ڈائرکٹر یونیسکو پہنچے تو کچھ عرصے بعد انہوں نے اپنے خسر سے خواہش کی کہ وہ کچھ دن تفریح کی غرض سے پیرس تشریف لائیں۔ آغا صاحب کے لیے ویزے کا انتظام کیا گیا اور ان کے جانے کی تاریخ مقرر ہوئی۔ آغا صاحب ہز ہائنس پرنس آف برار والا شان نواب اعظم جاہ بہادر کی خدمت میں سلام کے لیے تشریف لے گئے اور فرمایا، ''برخوردار معظم میاں کی خواہش پر پیرس جارہا ہوں۔ آپ کے پاس سلام کے لیے حاضر ہوا ہوں۔''

اعظم جاہ بہادر نے سنتے ہی فرمایا، ''توبہ کرو ہوش کے ناخن لو کیا آپ کی عمر اب پیرس جانے کی ہے۔ وہاں کی سیر تو بہت پہلے ہی کر لینی چاہیے تھی۔ اب اگر جانا ہی ہے تو مقدس مقامات کی زیارت کے لیے قصد سفر کرو۔''

آغا صاحب نے جواب میں عرض کیا، ''صاحب کیا بتاؤں پوری جوانی یہ دعا کرتے ہوئے گزر گئی کہ اللہ انگلینڈ بھیجے، سوئٹزرلینڈ بھیجے، فرانس بھیجے۔ اب بڑھاپے میں دست بہ دعا ہوں کہ اللہ مقامِ مقدسہ کی زیارت نصیب فرمائے۔ اس کے کھیل وہی بہتر جانے، اب میں کیا کرسکتا ہوں کہ میری جوانی کی دعا بڑھاپے میں قبول ہوئی۔''

والا شان اعظم جاہ بہادر نے فرمایا، ''تم کچھ بھی کہہ لو ان مقامات کو دیکھنے کے بعد کف افسوس ملنے کے علاوہ تمہیں کچھ اور حاصل نہ ہوگا۔''

آغا صاحب نے بڑی سنجیدگی سے جواب دیا، ''صاحب اللہ بڑا قدرت والا ہے وہ جب چاہے مردے میں بھی جان ڈالدے۔''

ان تمام واقعات سے پرے ایک اور واقعہ درج کرتا چلوں۔ پیرس میں بھی آغا صاحب اپنے مخصوص انداز کا لباس یعنی رنگین اطلس کا پاجامہ، ہمرویا جامہ وار کی خوش رنگ گل بوٹوں کی اچکن، سر پر چوخمی (سلاطین مغلیہ کے طرز کی) ٹوپی پہنے اور ہاتھ میں کپڑوں کے رنگ کی مناسبت سے تسبیح لیے رہتے۔ ایک کم عمر خاتون ان کی شخصیت اور لباس کو دیکھ کر بہت متاثر ہوئیں اور آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا۔ ان سے گفتگو کرنے کے بعد ایسی فریفتہ

ہوئیں کہ ان کی مرید بن کر رہ گئیں۔ آغا صاحب جب حیدرآباد آئے تو وہ بھی ساتھ ساتھ چلی آئیں۔ مجھے اس کا کوئی علم نہ تھا۔ ایک بار میں جب آغا صاحب سے ملنے پہنچا تو میرا تعارف ان محترمہ سے یہ کہہ کر کروایا، ''میاں ان سے ملو۔ یہ ہیں بی لطیفہ۔''

اس وقت تو میں خاموش رہا اور ان خاتون کے ادھر ادھر ہونے کے بعد میں نے آغا صاحب سے دریافت کیا کہ بھلا یہ کیا نام ہے۔ فرمانے لگے، ''اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا لطیفہ ہے۔''

آغا صاحب کے بیشتر جملے ایسے ہیں کہ جنہیں ضبط تحریر میں لانا کم از کم میرے لیے ناممکنات میں سے ہیں۔ سطور بالا میں لکھے گئے واقعات کو میں نے اپنے تئیں کافی سنبھال کر لکھنے کی کوشش کی ہے۔ لہٰذا انہی چند واقعات پر اکتفا کر رہا ہوں۔

(یہ مضمون آغا صاحب کے نواسے اور اپنے دوست نواب میر اصغر حسین کی خواہش پر لکھا گیا۔)

☆☆☆

مجتبیٰ حسین کے بارے میں دو ضخیم کتابیں شائع

فن اور شخصیت پر ممتاز اہل قلم کی تحریریں

بین الاقوامی شہرت یافتہ طنز و مزاح نگار مجتبیٰ حسین کی ادبی زندگی کے پچاس سال مکمل ہونے پر ملک کے نامور پبلشر ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤز دہلی نے مجتبیٰ حسین کی شخصیت اور فن پر دو نہایت مبسوط کتابیں شائع کی ہیں جن کے نام ہیں ''مجتبیٰ حسین: جیسا دیکھا جیسا پایا'' اور ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، ''مجتبیٰ حسین جیسا دیکھا جیسا پایا'' میں اس نامور ادیب کی شخصیت کے مختلف رنگا رنگ پہلوؤں پر ملک اور بیرون ملک کے مشہور اہل قلم کے نہایت دلچسپ تاثراتی مضامین شامل ہیں۔ یہ مضامین مختلف اوقات میں لکھے گئے تھے۔ پروفیسر وحید اختر، پروفیسر گوپی چند نارنگ، خواجہ حسن ثانی نظامی، مشفق خواجہ، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر، انتظار حسین، پروفیسر شمیم حنفی، فکر تونسوی، پروفیسر نثار احمد فاروقی، ڈاکٹر شہریار، یوسف ناظم، مرزا ظفر الحسن، پروفیسر یوسف سرمست، رفعت سروش، پروفیسر بیگ احساس، دلیپ سنگھ، نریندر لوتھر، علی باقر، کے ایل نارنگ ساقی اور کئی دوسرے اہم ادیبوں نے اپنے انداز میں مجتبیٰ حسین کو ''جیسا دیکھا جیسا پایا'' کے تحت اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ کئی شعراء نے منظوم خراج تحسین بھی پیش کیا ہے۔ انگریزی میں صاحب طرز ادیب خوشونت سنگھ، محمد علی صدیقی، علی باقر، عارف حسینی، بلراج ورما اور نقی علی کے سیر حاصل مضامین شامل ہیں۔ ''مجتبیٰ حسین آئینوں کے بیچ''، مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ ہے۔ اردو کا شاید ہی کوئی ایسا اہم ناقد رہا ہو جو اس منفرد طنز و مزاح نگار کے فن سے متاثر نہ ہوا ہو۔ پروفیسر آل احمد سرور، شمس الرحمٰن فاروقی، صدیق الرحمٰن قدوائی، ڈاکٹر قمر رئیس، جاپانی پروفیسر سوزوکی تاکیشی، پروفیسر مغنی تبسم، ڈاکٹر عتیق اللہ، ڈاکٹر مصطفیٰ کمال، رضیہ فصیح احمد، مصحف اقبال توصیفی، ڈاکٹر اشفاق احمد ورک، علی ظہیر، حسن چشتی، ڈاکٹر افسر کاظمی، زاہد علی خاں، من موہن تلخ، انور سدید، مخمور سعیدی، ڈاکٹر مظفر حنفی، علیم صبا نویدی، قمر علی عباسی، مظہر امام اور کئی دوسرے نقادوں نے مجتبیٰ حسین کے فن کا جائزہ لیا ہے۔ مجتبیٰ حسین کے فن کے بارے میں بے باکانہ انٹرویوز ایک مستقل باب کی حیثیت رکھتے ہیں جن میں زبیر رضوی، کمار پاشی، رشید انصاری، حامد اکمل، طاہر مسعود، فیروز عالم، حلیمہ فردوس اور کئی باریک بیں اصحاب کے نام آپ کو ملیں گے۔ دونوں کتابیں اہم اور یادگار تصاویر سے مزین ہیں۔ کتابت طباعت نہایت دیدہ زیب ہے۔ ان دونوں کتابوں کو سید امتیاز الدین اور محمد تقی نے مرتب کیا ہے۔ ہر کتاب کی قیمت ساڑھے چار سو روپے رکھی گئی ہے۔ ان کتابوں کو ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس 3108 وکیل اسٹریٹ، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی 6 اور ملک کے اہم بک اسٹالوں سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

نسیمہ تراب الحسن

مضمون

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا.....مایہ ناز شخصیت

یہ میری خوش نصیبی ہے کہ میں آغا حیدر حسن مرزا سے ایک بار نہیں کئی مرتبہ مل چکی ہوں اور اگر میں کہوں کہ ان سے میرا دو دو بول کا رشتہ بھی ہے۔ دو بول اگر سچے دل سے کہے جائیں تو اٹوٹ بندھن بن جاتا ہے۔ آغا صاحب نے خود اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے کہ ''سید غلام پنجیتن میرے بیوی کے بھائی جان ہیں تو میرے بھی بھائیجان ہوئے'' میرا میکہ وسسرال ایک ہی خاندان ہے۔ کہا جاتا ہے بیوی پیاری تو سالیاں میں کہوں گی کہ صرف سالیاں ہی نہیں بیوی کے سب ہی لوگ دل میں جگہ بنا لیتے ہیں۔ کیا آپ کو سگِ لیلیٰ کی اہمیت کا اندازہ نہیں ہے پھر وہ دل تو آغا صاحب کا دل تھا جو ہر کس وناکس کے لیے کشادہ۔ خیر یہ الگ باتیں ہیں۔ میں اس وقت ادب کا مطلب بڑوں کے ادب ہی کو سمجھتی تھی چناں چہ آغا صاحب کے گھر جاتی تو خاموش بیٹھی انھیں دیکھتی رہتی، دراصل ان کی شخصیت تھی ایسی کہ نگاہیں ان کے چہرے سے ہٹنے کا نام نہ لیتیں۔ ذہانت سے چمکتی بڑی آنکھیں، سرخ وسفید رنگ، شگفتہ مسکراتا چہرہ، دل کو لبھانے والا نور ہالہ بنائے ہوئے، اب بھلا نظر کا کیا قصور اور پھر متبسم لب کھلتے تو پھول جھڑنے لگتے۔ دھیمہ لہجہ، شہد کی مٹھاس لیے کانوں میں رس گھول دیتا۔ وہ مخاطب کسی سے ہوں قریب بیٹھے سبھی لوگ ہمہ تن گوش رہتے۔ خاطر مدارات کی سجی کشتیاں خاک اپنی طرف متوجہ کرتیں ان کی باتوں کے سحر میں ڈوبتے رہتے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہ ہوتا اور جب بادل ناخواستہ گھر جاتے تو آغا صاحب کی شگفتہ مزاجی، بذلہ سنجی اور منکسر المزاجی کی اعلیٰ اقدار سے مرعوب اور سرشار۔

آغا صاحب کی شخصیت اور فن پر دو سمینار ہوئے، تراب صاحب کو افسوس کہ ہم دونوں میں شریک نہ تھے۔ میں نے کہا اس زمانے میں ہم ڈسٹرکٹ میں تھے، اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت۔ اب ایک ذریعہ رہ گیا کہ آغا حیدر حسن مرزا کے بارے میں کتابیں پڑھی جائیں۔ بس جناب جہاں جہاں سے کتابیں ملیں لے کر مطالعہ شروع کیا تو خیال آیا ہر بات میں اللہ کی مصلحت رہتی ہے، اگر ہم سمینار میں تقریریں سنتے، مقالے سنتے تو ہماری عقل میں اتنی گنجائش کہاں جو سب ہضم کر لیتی، اب بہت کچھ مال غنیمت کی طرح ہمارے پاس آ گیا مانا کہ حیدر منزل میں جاتے رہے، آغا صاحب سے ملتے رہے، ان کی وہ تصویر جو گھر میں داخل ہوتے ہی گرم جوشی سے آپ کا استقبال کرتی اب بھی موجود ہے۔ اس کے اصلی پیکر کو ہم بہ نفس نفیس دیکھ چکے ان کی ساری مایہ ناز صفات سے لطف اندوز ہو چکے اب رہیں آغا صاحب کی ادبی باتوں کی تفصیل تو وہ ان کتابوں میں بڑے بڑے عالموں نے دانشوروں نے ریسرچ اسکالرس نے اپنی علمیت کے سہارے قلمبند کر دی ہیں جو ہماری سمجھ سے ہزار گنا قابل تحریریں ہیں۔ انھیں پڑھ کر شراب دو آتشہ کا مزہ آئے گا۔ ایک تو آغا صاحب کی باتیں اور پھر لکھنے والی قابل شخصیتوں سے باریک بین سے آغا صاحب کے جملوں، فقروں، قلم کی ہر جنبش سے جو روشنی ڈالی ہے۔ بھلا ہم ایسا کر سکتے تھے۔ مثلاً آغا صاحب کے داماد میر معظم حسین نے اپنی شاگردی کے زمانے سے آغا صاحب کے دم آخر تک کی روداد سنائی کہ وہ کس طرح کلاس روم سے باہر پورٹیکو کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر شاگردوں کو پڑھاتے کالج کا پرنسپل یہ دیکھ کر آگ بگولہ ہو جاتا مگر کچھ کہہ نہ سکتا تھا کیوں کہ طلباء مطمئن تھے بغیر نصاب کی کتاب کے کورس پر حاوی رہتے، خوش رہتے۔ آغا صاحب کے پاس کلاس میں جتنے شاگرد ہوتے کسی دوسری کلاس میں نہ ہوتے۔ معظم حسین صاحب نے آغا صاحب کی بیٹی مہرالنساء سے اپنی شادی کے بعد کے بہت سے واقعات سنائے اور ان کی زندہ دلی کی مثالیں بھی دیں جیسے کہ جب معظم حسین یونیسکو میں تھے اور آغا صاحب وہاں آئے۔ اسی عرصے میں آغا صاحب کو دل کا دورہ پڑا۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ آپ کے

دل کا صرف تھوڑا حصہ کام کر رہا باقی ختم ہو چکا تو آغا صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا سولہ برس کی عمر سے میں اپنا دل حسیناؤں میں بانٹ رہا ہوں۔ اسی سال کا ہو گیا اور آپ کہتے ہیں دل کا حصہ باقی ہے۔ ان کی ظرافت ڈاکٹر کے پلے نہ پڑی جب اس کو بتایا تو وہ بھی مسکرانے لگا۔ ایسی کتنی پر لطف باتیں معظم حسین صاحب نے سنائیں۔ معظم صاحب نے یہ بھی کہا کہ آغا صاحب صرف اردو میں ہی ماہر نہیں تھے بلکہ یونانی اور رومن ہسٹری لٹریچر اور یوروپین لٹریچر پر بھی عبور تھا۔ ان کے کتب خانے میں ارسطو، سقراط، پلیٹو، کارلائیل، بائرن، شیکسپیئر، اور کئی مشہور اہل قلم کی کتابیں موجود تھیں اور وہ ان تمام تحریروں سے اچھی طرح واقف تھے، ان کتابوں پر ان کے قلم کے لگے نشان اس کی گواہی دے رہے ہیں آخری عمر میں ترکی سیکھنے کی خواہش ہوئی۔ جب ان سے کہا کہ آپ کی صحت ٹھیک نہیں۔ کمزور ہو گئے ہیں تو جواب دیا کہ پھر میں کب سیکھوں گا۔

اب سنئے علامہ اعجاز فرخ..... آغا صاحب کے دہلی سے حیدرآباد آنے کے بارے میں کہتے ہیں کہ بدن ان کا تھا اور دل دہلی کا دھڑکتا تھا، گویا ساری دہلی ان کے وجود میں سما گئی تھی۔ آغا صاحب کی بیگماتی زبان کی مثال انھوں نے بڑے اچھے انداز سے کی ہے کہ ایک محفل مشاعرہ کی صدارت آغا صاحب کر رہے تھے جب وہ صدارتی خطبہ شروع کرنے والے تھے۔ تو سامعین میں سے کسی نے کہا'' آغا صاحب محلاتی زبان میں ارشاد ہو تو آغا صاحب نے فرمایا'' اے نوج ان نگوڑ و کو دیکھو چاہتے ہیں کہ دہلی کی بیگماتی زبان بے متبع ان مردوں کے بیچ چلی آئے، اس لاجونتی کو چھولوں تو حیا سے دہری نہ ہو جائے'' اعجاز فرخ صاحب کا کہنا ہے کہ آغا حیدر حسن صاحب کی شیریں سخنی میں فقط مولسری کی گھنی چھاؤں ہی نہیں، کدم کے پھولوں کی تازگی اور مہک بھی ہے۔ ان کی تقریر ہو یا تحریر فصاحت ان کی آن تھی، بلاغت ان کی جان تھی، برجستگی ان کی شان تھی، تخیل ان کی اڑان تھی وہ تو الفاظ تو لتے تھے گویا موتی رولتے تھے۔ آغا صاحب کی فصاحت کے تعلق سے انکا کہنا ہے کہ'' شوق جہاں بینی نے ان کو مخصوص دور تک محدود نہیں رکھا، وہ صدیوں کے فرزند تھے اور جب چاہتے ماضی کی گرد ہٹا کر آئینہ میں وقت کا چہرہ دیکھ لیتے''۔ پروفیسر شارب ردولوی کہتے ہیں کہ'' آغا حیدر حسن مرزا اپنے عہد کے ایک صاحب طرز نثر نگار تاریخ و تہذیب اور زبان و ادب پر ان کی گہری نگاہ تھی، ان کی تحریر میں ایسی دلکشی اور ان کے قلم میں واقعہ نگاری اور مصوری کی ایسی طاقت ہے کہ ان کے مضامین کو پڑھتے وقت یہی محسوس ہوتا ہے کہ ہم ان مناظر کے سامنے کھڑے ہیں''۔ شاہد حسین زبیری جنھوں نے آغا صاحب کو اپنے شعور سنبھالنے سے دیکھا، ان کا یہ نظریہ ہے کہ آغا صاحب تہذیب و معاشرت، زبان و بیان اور لہجہ رنگین کے بادشاہ تھے، چاہے دہلی ہو یا لکھنو، علی گڑھ ہو یا حیدرآباد سب کے یہاں کی تہذیبی قدریں آغا صاحب میں موجود تھیں جن کو انھوں نے مغلئی تہذیب میں بڑی خوب صورتی سے سمو رکھا تھا۔

نہ جانے کتنے افراد نے آغا حیدر حسن مرزا کی شخصیت پر قلم اٹھایا، کسی نے آغا صاحب کے سماجی اور تہذیبی شعور کا ذکر کیا، کسی نے ان کے سفرناموں کا حال سنایا، کسی نے آغا حیدر حسن مرزا بحیثیت انشاء نگار پر روشنی ڈالی، کسی نے ان کے مقدمہ نگاری کے بارے میں بتایا۔ کسی نے آغا صاحب کی مرقع نگاری کو لفظوں میں البم کہا، کسی نے آغا صاحب کی تحقیق و تنقید پر تبصرہ کیا، کسی نے ان کی بیگماتی زبان کے منفرد موضوع پر بات کی اور کوئی ان کی باغ و بہار شخصیت کے گن گانے لگا۔ کسی نے ان کی بچوں کی کہانیاں سنانے لگا اور کوئی ان کے ڈراموں کی یاد تازہ کرنے لگا اور ان کی دکنی لغت نویسی کا ذکر چھیڑا تو آغا صاحب کی عرق ریزی سے اس کی تدوین کا پتہ چلا تو اس اہمیت کو اجاگر کیا گیا کہ آغا صاحب نے قدیم اردو اور دکنی مخطوطات سے دستیاب ہوئے اور بعد میں متروک ہو گئے انھیں جمع کیا اور ان کے معنی بھی لکھے اور ہر لفظ کے قدیم دکنی کتابوں کے حوالے دیئے۔ جس سے آغا صاحب کے ذوق تحقیق کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ بہرحال آغا حیدر حسن مرزا کی شخصیت ایک ہمہ جہت صفات سے معمور تھی جو عالمگیر شہرت کی حامل تھی۔ جس کا اندازہ ہم کو اس بات سے ہو جاتا کہ ان

کے گھر ان سے ملنے آنے والوں میں سیاسی، سماجی، مذہبی، علمی بڑی بڑی نامور ہستیاں تھیں جوان کے اخلاق اور عالمانہ خوبیوں کی وجہ سے ان کے معتقد تھے سبھی آغا صاحب کی خوش مزاجی شگفتہ پُر لطف گفتگو، ان کے بے لوث خلوص، ان کے بلا مذہب وملت اور بغیر دولت و حشمت کی تفریق کا برتاؤ دیکھ کر آغا صاحب کی غیر معمولی شخصیت سے مرعوب ہو جاتے۔ شاید لوگوں کو یقین نہ آئے کہ آغا صاحب کے پاس آنے والوں میں پنڈت جواہر نہرو، سروجنی نائیڈو، ان کی بیٹیاں پدمجا اور لیلامنی، نواب چھتاری، غلام محمد، سالار جنگ، مہاراجہ کرشن پرشاد، فصاحت جنگ، صلابت جاہ مکرم جاہ، اعظم جاہ، فرحت اللہ بیگ، عبد الرحمٰن چغتائی، حسن نظامی، جوش، فانی، جگر، مخدوم اور کتنے مختلف ممالک کے سفیر جو دہلی آتے وہ ضرور حیدرآباد آغا صاحب سے ملاقات کی خاطر ان کے پاس تشریف لاتے اور شاگردوں کا تو صبح سے شام تک تانتا بندھا رہتا ہے۔

آغا صاحب سب سے خندہ پیشانی ملتے اور اپنی شفقت سب پر نچھاور کرتے رہتے کسی طرح کی بناوٹ کا شائبہ بھی نہ رہتا۔ آغا صاحب بادشاہ وقت نہ تھے لیکن ان کا حسن سیرت تھا، ان کی شخصیت کی مقناطیسیت تھی جس نے اپنے قدر دانوں کے دلوں کو جیت لیا تھا اور سب ان کے گرد ایسے منڈلاتے جیسے شمع پر پروانے۔ بے شک وہ آداب معاشرت میں بڑے مہذب، شائستہ اور زندہ دل تھے اپنی خوش مزاجی، بذلہ سنجی اور قابلیت سے علم و ادب کے دانشوروں، ادیبوں، شاعروں، سیاسی رہنماؤں اور مذہبی عالموں کے دل و دماغ پر انتہائی سادگی وانکساری کے ساتھ اپنی ذہانت کا سکہ بیٹھا دیتے تھے۔

قابل تعریف ہیں ان کے داماد معظم حسین کہ آغا حیدر حسن مرزا کے انتقال کے بعد یونیسکو سے استفادے کر حیدر منزل میں ایک میوزیم پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا کے نام سے قایم کرنے کی جدو جہد میں مصروف ہو گئے۔ آغا صاحب کی بیٹی مہر النساء اور ان کی اولاد اس اسکیم کو پائے تکمیل تک پہنچانے میں ہر طرح کام کیا۔ آغا صاحب کی آخری کتاب ''دکنی لغت و تذکرہ دکنی مخطوطات'' جو انھوں نے چالیس سالہ جان فشانی سے مکمل کی تھی مگر منظر عام پر نہ آسکی تھی، شائع کی گئی۔ ان کی نایاب کتابیں، مخطوطات، ان کا لباس شیروانیاں، ٹوپی، جوتے، ان کے نوادرات اور ان کی شخصیت سے منسلک ہر چیز کو قرینے سے سجایا گیا اور پھر اس خیال سے کہ پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا جیسی مایہ ناز ہستی سے نئی نسل واقف ہو اور جوان کی شخصیت وفن پر ریسرچ کرنا چاہے انھیں یہاں سے مستفید ہونے کا وسیلہ ہو جائے، یہاں پر سمینار کا سلسلہ بھی شروع کیا گیا۔ یہ سب آغا صاحب کے داماد، بیٹی اور ان کی اولاد کی دوررس نگاہوں کا عطیہ ہے جو علم وادب کا ذوق و شوق رکھنے کی پیاس بجھانے کا ذریعہ ہے۔ آغا صاحب کے نواسے نواسیاں ہندوستان سے باہر مغربی ممالک میں رہتے ہیں لیکن وہ مسلسل والدین کے پاس آکے رہتے ہیں، نہ صرف ان کی فکر میں ہلکان بلکہ آغا صاحب کے میوزیم کی دیکھ ریکھ کرتے رہتے ہیں۔ آپ آج بھی حیدر منزل جائیں تو احساس ہوگا کہ میرا صغر حسین اور اس وقت جو دوسرے بچے موجود ہیں آپ سے اسی طرح آداب واخلاق سے ملتے ہیں جو ہماری تہذیب ہے۔ خوشی سے آنے والے مہمان کا استقبال کرنا، جھک کر سلام کرنا، ان کی ہر ادا میں آغا صاحب کی شخصیت کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یقیناً یہ آغا صاحب کی تربیت کا اثر ہے جو انھوں نے نہایت خوش اسلوبی سے اپنی وراثت میں اپنی اولاد اور ان کی اولاد کو دی۔ معظم حسین تو اب نہیں رہے، مہر النساء جن کو سب شہزادی آپا کہتے ہیں باوجود اپنی خرابی صحت کے آنے والوں کے پاس آکر بیٹھتی ہیں، مسکراتے ہوئے باتیں کرنا، خاطر مدارات کرنا، ماضی کی دل فریب یادیں ماحول کو خوش گوار بنا دیتیں ہیں۔ خدا ان کو صحت دے، عمر دراز ہو آمین! بس کمی رہتی ہے تو آغا صاحب کی، ان کی پُر لطف باتوں کی، ان کی نقرئی ہنسی کی، ان کے چٹکلوں کی.....

☆☆☆

آمنہ انصاری

مضمون

آغا صاحب باغ و بہار شخصیت

شدت کی گرمی کہ زبان سوکھ کر تارق سے لگی جارہی ہے بجلی کبھی کی بند ہو چکی تھی (کہ اس شہر میں یہ رونا بہت ہو چلا) اف اف کہیں سے ٹھنڈی ہوا کا کوئی جھونکا آجائے۔ الٰہی ابر آئے مغرب سے گھٹا اٹھے، بر سے کہ ڈال ڈال پات پات سوکھ چلے ہیں۔ آدم کے اولین گناہ کو تو تو نے معاف کر دیا تھا، اب اولاد آدم سے اتنی کیا ناراضگی! الٰہی الٰہی..... اچانک کسی نے کمرے میں آنے کی اجازت چاہی۔ نحیف و ناتوان جثہ، سفید داڑھی نورانی چہرہ اور آنکھیں..... دل میں اتر جانے، اس کے سارے بھید جان جانے والی تیز آنکھیں . . . . . ارے یہ تو غنی خان صاحب ہیں..... ارے صاحب آپ کو اجازت کی کیا ضرورت ہے کہ آپ جیسے دانشوروں کے لیے تو دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں۔ دیدہ و دل فرش راہ.....

آپ کو 16/تاریخ صبح دس بجے آغا حیدر حسن صاحب کے مکان پر چلنا ہے غنی خاں صاحب نے فیصلہ کن انداز میں کہا..... آغا صاحب! آغا صاحب! ارے یہ کس کا نام آپ نے لے لیا کہ میرے نطق نے بوسے میری زبان کے لیے..... اور اس نام کے لیتے ہی جیسے موسم بدل گیا، ٹھنڈی ہوا کے جھونکے آئے اور آسمان کے کناروں کا رنگ گہرا ہونے لگا۔ ان ہی رنگوں میں گھلے ملے ماضی کے رنگ بھی تھے..... ماضی..... ماضی کی جانب دیکھنا تو میں نے کبھی کا چھوڑ دیا۔ سنیے کیسی آوازیں آتی ہیں لی جیو، دوڑ یو، پکڑ یو جانے نہ دیجیو، ماضی کا خوب صورت جنگل .....وہ گھنی پگڈنڈیاں وہ بلند بالا درخت کہ جن کے اوپری سروں نے مل کر راستوں پر تاریکی پھیلا دی ہے۔ ماضی کے اس جنگل میں مجھے سفر کرنا ہے، نیم تاریک راستوں پر۔ وہ زبان کی جھاڑیاں خوشبودار پھولوں سے لدی جھاڑیاں جواب تیز نوکیلے کانٹوں میں بدل گئیں ہیں۔ مجھے سفر کرنا ہے دھیرے دھیرے ان جھاڑیوں کو ہٹاتے ہوئے اور یکلخت مجھے محسوس ہوا کہ جیسے صبح سویرے سورج نکلنے سے پہلے اوس سے بھیگے، سبزے پر ننگے پاوں چلنے سے جو ٹھنڈک تلووں میں تراوٹ رول دیتی ہے دیسی ہی ٹھنڈک آنکھوں میں اتر پڑی۔ وہ دیکھئے یاد کے اس جنگل کے بیچوں بیچ میرے ماضی کا دیوان جس کے شہ نشینوں پر متمکن ہستیاں مجھے بغور دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہیں اور آگے جنگل کے کنارے نیلا مواج سمندر اور اس میں وہ شاندار جہاز جس کی پوری روشنیاں کھلی ہوئی ہیں اور عرشہ پر کہر یلی چاندنی پھیلی ہے۔ اس عرشہ یہ کچھ پرچھائیاں سی ہیں۔ اور یہ ہنسی.... یہ ہنسی کس کی آواز کی تھی کہ مانو چاندنی کے گھنگرو بج اٹھے۔ کوئی کھلکھلا کر ہنسا۔ ہاں یہ ہنسی جانی پہنچانی ہے۔ یہ پرچھائیں.... یہ پرچھائیں یہ آواز زینت آپا کی ہے اور وہ دیکھئے زینت آپا کس سے محو گفتگو ہیں..... سرخ و سفید رنگت جیسے میدہ میں شہاب گندھا ہو..... چہرہ کا وقار اور دبدبہ جو رگوں میں خالص خون دوڑنے کی علامت ہے۔ نورانی چہرہ تیز مسکراتی ہوئی آنکھیں.... آغا حیدر حسن جو مغل شہنشاہوں کی نشانی تھے۔ وہ رعب وہ حسن وہ وقار .....زینت آپا ان کی بہت ہی عزیز شاگرد ایک روز مجھے اپنے ہمراہ آغا صاحب سے ملوانے لے گئیں۔ آغا صاحب زینت آپا کو دیکھ کر خوش ہو گئے۔ آغا صاحب میں امنہ کو آپ سے ملوانے لائی ہوں۔

''اچھا اچھا ٹھیک ہے'' انہوں نے میرے سر پر ہاتھ رکھا۔ ''پہلے یہ بتلا کہ تیری شادی شدہ زندگی کیسے گزر رہی ہے'' (زینت آپا اپنی شادی کے بعد پہلی مرتبہ ان سے ملی تھیں) آغا صاحب بہت اچھی طرح میں اچھی گرہستن بن گئی ہوں۔ خوب کام کرتی ہوں اور بابو کو کھانا پکا کر کھلاتی ہوں'' (زینت آپا نے اپنے شوہر حسینی شاہد کو بابو کہتی تھیں اور ہم لوگ شاہد بھائی) آغا صاحب بے ساختہ ہنس پڑے۔

''خاک پکاتی ہوگی۔ ارے تو بیٹھے بیٹھے اس غریب کا کلیجہ پکاتی ہوگی'' آغا صاحب کا یہ جملہ مجھے یاد رہ گیا۔ آغا صاحب کے پاس غالب کی ٹوپی اور فرغل تھی (شاید اب بھی ہوگی) ہم نے کالج کے فنکشن میں غالب کے شعر پر جو مرقع پیش کیا تھا اس میں یہی ٹوپی اور فرغل استعمال کی تھی۔ آغا صاحب نے ایک بقچہ میں باندھ کر ہمارے حوالے کی اور دوسری ہی دن زینت آپا نے خود آغا صاحب سے مل کر انھیں لوٹا دی۔ چوک کی گھڑیال کے پاس جو چمن ہے اس کے اطراف چھوٹی چھوٹی شطرنجیاں بچھائے دکان دار پرانی چیزیں فروخت کرتے تھے۔ میں نے اکثر آغا صاحب کو ان دکانوں کے پاس دیکھا ہے نوادرات تلاش کرتے ہوئے۔

دربار ہال میں مشاعرہ تھا آغا صاحب مہمان خصوصی کی حیثیت سے تشریف لانے والے تھے اور ہم سب ان کے انتظار میں سیڑھیوں پر کھڑے تھے۔ آغا صاحب آئے۔ ہمرو کی شیروانی، اونچے کھڑے حاشیہ کی ٹوپی، مشہدی رومال، دربار ہال یکدم جگمگا اٹھا۔ ہم سب ان کے اطراف جمع ہوگئے ان کی باتیں سننے ..... دلّی کی بیگماتی زبان۔ آغا صاحب کی شہد برساتی آنکھیں، محبت بھرا لہجہ، محلوں کی کہانیاں، ارد ابیگنی اور قمقلنی کے قصے۔ آغا صاحب کی شخصیت نہ تھی، تاریخ کا ایک ایسا ورق تھا جس پر تہذیب وتمدن کے سارے اصول درج تھے۔

آغا صاحب کی یاد کے ساتھ ہی عجیب سی ٹھنڈک کا احساس ہونے لگا ہے ان کی لحد میں کچی کلیاں اتریں..... جانے جنت کی کس گلی میں جوہی اور چنبیلی کی کلیاں چن رہے ہوں گے۔

☆☆☆

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

طیبہ بیگم بلگرامی

مضمون

گھر سے کالج تک

آغا حیدر حسن صاحب سے میرا سسرالی رشتہ ہے۔ میرے شوہر سنجر علی خاں بن مہر النسا بیگم اور محترمہ بدر النساء بیگم (زوجہ آغا حیدر حسن) بنت مرتضیٰ بیگم اور امیر حسن صاحبہ کے نواسے ہیں۔

میر اصغر حسین آغا حسن مرزا کے نواسے کچھ عرصہ پہلے مجھ سے کہنے لگے آپ آغا سے اچھی طرح واقف ہیں کیوں نہ ایک مضمون ان کے بارے میں لکھتیں؟ میں نے کہا آغا کے بارے میں باتیں کرنا الگ بات ہے۔ ان پر مضمون؟ یہ تو جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ معاف کیجئے! یہ میرے بس کی بات نہیں ان کے اصرار پر میں نے کوشش ضرور کی ہے اور یہ انہیں کی ہمت افزائی کا نتیجہ ہے جو آپ کے سامنے پیش ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب آغا اکثر ہمارے گھر آتے۔ امّی بابا سے گھنٹوں باتیں ہوتیں جیسا کہ سب جانتے ہیں ان کے مزاج میں مزاح اور شرارت کوٹ کوٹ کے بھری تھی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ ہماری بیٹھک ان کے قہقہوں سے گونج رہی تھی۔

میں چائے کی کشتی لے کر پہنچی تو اپنے پہلو میں بٹھالیا۔ امّی پوچھ رہی تھیں بھائی آپ چاند پاشاہ (مرزا سر تاج حسین) کی شادی کب کر رہے ہیں؟ بس اتنا پوچھنا تھا کہنے لگے۔ کیا بتاؤں عجیب الجھن میں ہوں۔ یہ لڑکے نے تو مجھے کہیں کا نہیں رکھا۔ نہ کسی سے ملنا نہ جلنا۔ اگر پڑوس میں تاک جھانک کی ہوتی، کہیں سے شکایت آتی تو کچھ سوچتا۔ اب بتاؤ کہاں اور کس منہ سے اس کی نسبت لے کر جاؤں؟ کچھ عرصے بعد اللہ اللہ کر کے ان کی شادی طے ہوگئی اور چاند پاشا اپنی شادی کے رقعہ لے کر خیر انساء خالہ جان کے پاس پہنچے مبارک سلامت کے بعد رقعہ دیکھا۔ پوچھنے لگیں آپ کی شادی حضور نظام کی صاحب زادی سے ہے؟

آغا صاحب مجھے اب بیٹی نہیں، سلڑی کہہ کہ مخاطب ہوتے۔ میں نے کہا کیا چچا، اتنا بھدّا نام دے رکھا ہے آپ نے۔ تو کہتے تم میرے سالے کی بیوی ہوئیں تو اس ناطے سے میری سلڑی ہوئیں کہنے کو باتیں تو بہت ہیں اب ان کے اطراف کا جائزہ لیتے ہیں اور واپس جاتے ہیں اس دور میں جب ہماری ملاقاتیں اکثر بنجارہ بس، میں ہوا کرتیں۔ یہ بس آر ٹی سی کی واحد بس تھی جو کوٹھی، بنجارہ ہل اور پنجہ گٹہ کے بیچ چلائی جاتی۔ ہمارا اسٹاپ روڈ نمبر 14 پر مشتاق خالہ جو جناب ضیا الحسن صاحب (جانو بھیا) کی بیگم تھیں انہیں کے بنگلے کے آگے رکتی۔ دل چسپی کی بات یہ ہے کہ اس بس کا ڈرائیور John جون اور کنڈکٹر اپنے رٹائرمنٹ تک اسی بس سے منسلک رہے۔ اس روٹ کے ریگولر پسنجر کم سے کم بیس آدمی ان کی ہارن کی آواز پر دوڑتے آتے جب تک سب نہ آجاتے بس رکی رہتی اور مشتاق خالہ کے گھر سے ان کے لیے چائے آجاتی۔ ہمارا اگلا اسٹاپ جناب غلام پنجتین کا بنگلہ جو مس نندی کی اتار پر تھا ہارن کی آواز پر عسکری پنجتن دوڑتے آتے پیچھے تراب الحسن صاحب بوکھلائے ہوئے آدھی شیروانی پہنی آدھی چڑھاتے ہوئے، لپک کر بس پکڑے ایسا نہ ہو کہ بس نکل پڑی اور ہم بے بس ہو جائیں ہائے!

اب ہم آپ کو اس اسٹاپ پر لے چلتے ہیں جہاں ہمارے ہر دل عزیز آغا صاحب بس کے انتظار میں جانے کتنی سگریٹیں پھینک ڈالی دور سے نظر آتے وہی بانکپن! آنکھوں میں

سورمہ منہ میں گلوری جیسے ہی بس میں قدم رکھا، آداب سلام دعا کے ساتھ ہی بس کا ماحول بدل گیا۔ ہر طرف ہنسی کی پھلجھڑیاں چھوٹنے لگیں۔اس کے پیچھے پلومن صاحب نے اپنی سیٹ سنبھالی۔ یہ سٹینلی گرلز ہائی اسکول کے اردو ٹیچر ہیں۔اردو شاعری کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔انہوں نے یہ قصہ سنایا کہ جب انہوں نے شعر کہنا شروع کیا تو اپنا تخلص خاک رکھا اور پہلا شعر اپنی بیوی کو نذر کیا۔ کہتے ہیں ''خاک ہو گئے ہم تم کو خبر خاک نہیں، خاکساری کے سوا خاک کے گھر خاک نہیں، اس پر خوب واہ واہ ہوئی۔بس کیا تھی ایک تفریح گاہ تھی۔بس کے پسنجر بھی زندہ دل۔اب مشتاق خالہ کو ہی لے لیجئے گا ہے ماہے بس میں سفر کر لیتیں اپنا سودا سلف لے آتیں۔ بڑے مزے کی خاتون تھیں ایک دن عابد روڈ پر ان کو ایک موز کی بنڈی نظر آ گئی ڈرائیور سے کہا ارے بیٹا! گاڑی ذرا ادھر کو روک لے بس ابھی گئی اور آئی۔ ڈرائیور نے ترنت گاڑی سائیڈ پر لے لی۔ یہ اتریں اک بڑی سی پھنی لے کر آئیں۔ یہ بھی تو ان کا بہت خیال رکھتیں۔کرسمس میں ان کی گل پوشی کرتیں اور کرسمس کیک تحفے میں دیتیں۔اک بار جون کے مہینے میں طوفانی بارش ہو رہی تھی ممتاز حسن کا مکان قدرے اونچائی پر واقع تھا امیر خالہ سنجر علی خاں سب کے گھر وہیں تھے۔ جون نے یہ سوچ کر یہ تو بری طرح بھیگ جائیں گے۔بس کا رخ موڑ دیا اور ان سب کو گھر تک پہنچا دا۔اس واقعہ سے آپ اس شخص کی انسانیت اور ہمدردی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔کیا لوگ تھے۔کیا چھوٹے کیا بڑے۔انسان زندگی میں کیا کیا چیزوں سے گذر جاتا ہے اس دوڑ میں ہر چیلنج کو قبول کرتے ہوئے سلیقے سے زندگی گزار دے تو سپھل ہو جائے اور شاید آغا نے یہی کیا۔ دوستیاں، رواداریاں، ملنساریاں، قابت داریاں، سب نبھائیں۔ ہمیں جینے کا حوصلہ سکھایا۔جب موت نے دستک دی تو ہنستے بولتے اس دنیا فانی سے رخصت ہو گئے۔

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین

کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب

سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:

زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶

ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

آغا حیدر حسن مرزا

خاکہ

دادا حسینی

دادا حسینی کا نام تو ہمارے خاندان میں کسی کو معلوم نہ تھا میں ان کو دادی کہا کرتا تھا اور میرے پھپّی زاد بہن بھائی ان کو نانی کہا کرتے تھے میری دادی حضرت ان کو بوا حسینی اور کبھی حسینی خانم کہا کرتی تھیں۔انہوں نے اپنا نام خود رکھا تھا۔ یہ عاشق اہل بیت تھیں اور محرم کے دس دنوں میں آزدیادغم سے ان کی حالت مجنوں کی سی ہو جاتی تھی۔حضرت علی کو مولا مشکل کشا کہا کرتیں اور ادب سے نام نہ لیتیں کہا کرتی تھیں کہ میں نے اپنا نام حضرات امام حسین سے نسبت پر رکھا ہے یہ نواب عبدالرحمٰن صاحب والیٔ جھنجر کی بیوی تھیں۔نواب کا خطاب تھا لیکن انہوں نے کبھی اپنے منہ سے ان کا ذکرنہیں کیا۔نواب جھجر کے حالات خوب سنایا کرتی تھیں۔نواب کا دیوان عام سرتا پا چاندی کا تھا اور دیوان خاص پورا سونے کا تھا۔ نواب کی چودہ بیویاں تھیں احتشام الدولہ حکیم احسن خاں پہلے جھجر ہی میں ملازم تھے۔ نواب کے ہاں اہل کمال کی بڑی قدر ہوتی تھیں۔حکیم آغا جان عیش کا بھی جھجر سے تعلق تھا۔ میری دادی سے ملیں اور ان کے پاس نوکر ہو جانے کی خواہش ظاہر کی۔ میری دادی حضرت کو ان کے مصاحبوں اور مغلائیوں نے سمجھایا کہ ایک طرح دار جان جوان کا رکھنا نامناسب ہے لیکن میری دادی حضرت بڑی قیافہ شناس تھیں کہ دلی کھونے کے بعد اللہ نے ان کو یہ نعمت دی ہے۔ان کو پانچ روپیہ ماہوار پر رکھ لیا۔ یہ پانچ روپے اس زمانے کے ہیں جب دلی والے انگریز کے ہاتھ آٹھ روپے تولہ سونا بیچا کرتے تھے اس طرح دادا حسینی 1858ء میں ہمارے خاندان میں آئیں میری بڑی پھوپی کو انہوں نے پالا پھر چھوٹی پھوپی صفدری بیگم کو بھی انہوں نے پرورش کیا جب میرے والد آغا صفدر حسن مرزا پیدا ہوئے ان کی پرورش بھی انہی کے ذمہ کی گئی اور جب میں پیدا ہوا تو میری پرورش اور تربیت میں بھی ان کا بڑا حصہ رہا۔ یہاں تک تو سنی ہوئی باتیں بیان کیں۔ اب آنکھوں دیکھی سنئے۔ کشیدہ قامت جسے ہرچھریرا بدن۔ پھرتی غضب کی رنگ گندمی پتلی ستواں ناک پتلے پتلے ہونٹ، منہ میں ایک دانت نہ تھا۔ سر سفید گالا بڑی بڑی روشن آنکھیں کھنچی ہوئی سفید بھویں۔ چہرے پر جھریاں اس قدر کھریا کی چنی جامے کی استین معلوم ہوتا تھا۔ ہاتھوں پر ابھری ہوئی رگوں کا جال پھیلا ہوا سفید لٹھے کا تنگ موری کا سیدھا پاجامہ ڈور یلے یا گاگم کی نیفے سے نیچی کرتی الفی گریبیاں کی وہ بھی سفید بھک اور سفید سوتی ململ کا ڈوپٹہ دیڑھ پاٹیا گلے میں خاک شفا کی تسبیح کار خیر میں سب سے آگے رہتی تھیں گھر میں ایک سنگ سرخ کی جالی تھی اس کے پاس ایک چھوٹے سے مربع تخت پر ان کی مخمل کی جانماز بچھی رہتی ایک پلنگڑی پر کبھی بلبل چشم کا دولڑا کبھی مجنوں بچھا ہوا ہوتا پٹی کے پاس چھوٹا سا قلعی دارا گالدان چوکی چھوٹی پانوں کی قطبی جالی کے پاس بجیرہ میں جھری اس پر کٹورا اوندھا ہوا گرمی میں سفید چادر اوڑھتی اور جاڑوں میں رضئی کا کریزی اور لال قند کا استر کالے پر ہٹے کی شش انگشتی گوٹ سرہانے چھوٹی سی تکینی رکھی جو چھوٹے چھوٹے نمونے کے نکڑے جوڑ کر بنائی گئی تھی ایک ایک گرہ کے چورکور نمونوں کا سالا گمیا اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا گاوتکیہ یہ چھوٹی چھوٹی نمونوں کی کترنیں جوڑ کر ایسی خوب صورت بنا لیتی تھیں۔

گھر کے تمام نوکروں پر ان کا برا رعب تھا اور ہر یک نوکر ان کی عزت کرتا مزاج میں غصہ بہت تھا اس لیے دوکاندار تک

ان سے ڈرتے تھے۔ باہر کا سودا سلف قیمتی سب ان کے ذمہ تھا۔ کپڑا وہی پورے گھر کا خریدتی تھی اور شادیوں کے جہیز کا کپڑا گھر میں بیزازوں کو لاکر پسند کراتی اور دام خود چکاتیں۔ اس طرح جوہری بھی زیوران ہی کی معرفت داخل کراتے ان کا اعتبار اور ساکھ اتنی تھی کہ لوہارو والیاں اور پٹوڈی والیاں بھی خرید وفروخت ان کی معرفت کراتیں اور ہمارے ہاں سے اجازت لے کران کو بلواتیں وہ پردہ نہیں کرتی تھیں۔ اور نہ برقعہ اوڑھتی تھیں کالی سلیم شاہی جوتی پہن کر بازار جاتیں۔ جس بازار سے نکلتیں دوکان دار انہیں دیکھ کر کھڑے ہوکر سلام کرتے اور جس دوکان پر وہ جاتیں دوکاندار اپنی گدی سے الگ ہوکر بیٹھتا اور ان کی خاطر تواضع اور بڑی عزت کرتا۔ اکثر مجھے اپنے ساتھ لیجایا کرتیں۔ جب میں مدرسہ میں داخل ہوا تو یہ ساتھ جایا کرتیں اور ساتھ آتیں میلے کا بڑا شوق تھا۔ اس کے حوالے کر کے بھول گئیں اور سمجھیں کہ میں کھو گیا جب تعریئے ٹھنڈے ہو گئے اور ان کو میرا ہوش آیا تو دیوانوں کی طرح ادھر اُدھر ڈھونڈنے لگیں اور جب میں نہ ملا تو کنویں میں گرنے گئیں۔ لوگوں نے پکڑ لیا ایک فیل مچا میرا اچا اور میں بھی دوڑے ہم کو دیکھ کر فوراً سجدے میں گر گئیں اور توبہ کی کہ اب کبھی مجھ کو نہ چھوڑیں گی۔ قدم شریف کے میلے، سید حسین رسول نما کا میلہ، بسنت رام لیلا دیوالی، پھول والوں کی سیر ہوتی، شاہ بڑے کا میلا، تیراکوں کا میلہ ٹرکا میلہ محلدار خاں کے تعریئے یہ سب انہی کے ساتھ دیکھے جب میں پہلے پہل مدرسہ میں داخل ہوا ایک ہائی اسکول تھا۔ مولوی عبدالعلی جو میرے والد کے استاد تھے۔ صدر مدرس تھے۔ مولوی مبارک علی پہلی جماعت کو پڑھاتے تھے۔ مجھے انہوں نے پڑھانا شروع کیا اور فرمایا کہ الف میں نے کہا الف انہوں نے کہا نہیں بے الف کہہ میں نے کہا۔ نہیں بے الف کہہ غرض جو وہ فرماتے تھے میں دوہرا دیتا ان کو غصہ آیا مجھے بہت مارا میں بلبلا کر رویا میری آواز سنکر وہ صحن سے دالان میں اس طرح دوڑ کر آئیں جیسے چیل مجھے فوراً گود میں اٹھالیا اور مولوی صاحب سے کہا صدقے میں اتارا تمہیں اس جگہ پر سے جہاں میرے بچے کی دائی نے ہاتھ دھوئے تھے۔ تمہیں مولوی کس موے نے بنایا۔ تمہارے ہاتھ میں تو چھرا دے کر سامنے کندہ رکھ دینا تھا وہ بچارے ہکا پکا ہوکر رہ گئے وہ مجھے فوراً سوار کرا کر گھر واپس لے آئیں اور ایک سال گھر پر ہی تعلیم ہوتی رہی اور مرزا اختر کی بیٹی اور نواب ولیداد خاں والی مالاگڑھ کی بیٹی مجھے پڑھاتی رہیں پھر میری والدہ کے اصرار پر مجھے مدرسہ بھیجا گیا۔ ایک دفعہ میرے والد صاحب اور دادی صاحبہ میں تکرار ہوئی دونوں کی آواز تیز ہوکر صحنچی سے باہر آئی۔ دادی حسینی وہاں گئیں اور میرے والد صاحب کا کان پکڑ کر ایک طمانچہ رسید کیا وہ سرخ ہو گئے اور فوراً دیوان خانہ میں خاموش چلے گئے۔ دادی حسینی نے دوروز اس غم میں کہ انہوں نے میرے والد کو مارا ہے کھانا نہ کھایا اور میری دادی حضرت کے سامنے نہ آئیں۔ دوسرے دن میری دادی حضرت اور باوا جان خود ان کے پاس گئے اور کھانے کے لیے کہا۔ خوب روئیں اور بڑی مشکل سے کھانا کھایا باوا جان کو وہ پیار سے شدن کہا کرتی تھیں۔ خربوزہ، آڑو، امرود کیلہ لوکاٹ اور آم بہت پسند کرتیں۔ گرمیوں میں نہ خس خانے میں سوتیں نہ تہہ خانے میں اور نہ پنکھا جھیلتیں سے شرابور ہو جاتیں لیکن پنکھا نہ ہلاتیں۔ البتہ پنکھا رہتا پاس ضرور تھا اپنے کپڑے آپ ہی سیا کرتیں۔ مولسری کے پھول بہت پسند تھے۔ پھول کبھی نہیں پہنتیں۔ بلکہ ڈوپٹے کے آنچل میں باندھ لیا کرتیں۔ چارخانے کا ایک گزارومال ہمیشہ ہاتھ میں رہتا۔ نماز کی بڑی پابند تھیں اور وظیفے بھی پڑھا کرتیں۔ خاندان کی سیاست میں ان کا بڑا اثر تھا۔ ان کا مشورہ ہمیشہ رفع شر کا ہوتا۔ میرے زمانے میں ان کی تنخواہ ایک روپیہ ماہوار ہوگئی تھی۔ وہ اسی پر قانع تھیں۔ اکثر گھرانوں سے ان کو پندرہ پندرہ روپے اور بیس بیس

روپے ماہوار پر رکھنے کی کوشش ہوتی لیکن انہوں نے کسی اور جگہ رہنا برا سمجھا۔ ان کی بہن فرزانہ بھی دلی میں آ گئی تھیں۔ وہ نواب سردار جہاں بیگم زوجہ نواب ممتاز حسن خاں پٹوڈی کے پاس رہتی تھیں۔ انکا ایک لڑکا تھا عبدالقیوم خاں، وہ انگریزوں کی خانساماں گیری کرتا تھا۔ اس نے ولی کی ایک خانگی ڈال لی تھی کوئی اولاد نہ ہوئی اور وہ دونوں مر گئے چیلوں کے کونچے میں رہتے تھے۔ دادی حسینی ہمیشہ ان کے مدد کیا کرتی تھیں۔ جب مرنے کی خبر سنی تو صبر کیا اور کہا کرتیں کہ اللہ نے پردہ ڈھک لیا۔ گو قیوم کی بیوی دلی کے شریف گھرانے کی تھی لیکن دلی کی تباہی میں جو مصیبت شریفوں پر پڑی اس کو برداشت نہ کر سکی۔ خانگی بن گئی نکاح کر لینے کے بعد بہت عبادت کیا کرتی اور نماز میں روتی بہت تھی دلی کی تباہی کے وقت وہ تیرہ چودہ برس کی تھی فوجیوں کے ہاتھ میں پڑ کر غارت ہوئی اور تین چار برس بری زندگی گزاری۔ جب قیوم سے نکاح ہو گیا تو گھر کا کام کاج اور عبادت کے سوا دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ دونوں میاں بیوی ادھیڑ ہو کر اپنی نانی اور خالہ کے سامنے ایک مہینے کے اندر مر گئے پہلے میاں مرا پھر بیوی۔

دادی حسینی میری دادی حضرت کو تخلیے میں بیگم صاحب کہا کرتیں اور دوسرے ملازموں اور مہمانوں اور ملنے جلنے والوں کے سامنے سرکار کہہ کر مخاطب کرتیں۔ ایک دفعہ مجھ کو شاہ مروان اپنے ساتھ لے گئیں۔ میرا چاچا بندو بیگ ساتھ تھا۔ میری والدہ ان سے بہت ڈرتی تھیں۔ میں نے جب ان سے دریافت کیا کہ صرف انہوں نے باوا جان ہی کو کیوں مارا تو انہوں نے کہا کہ میں نے پالا ہے مجھے ان کی حرکت بری معلوم ہوئی کہ تو تو میں میں کی آواز دوسرے نوکر سنیں اور محل کی جگ ہنسائی ہو۔ مجھے غصہ آ گیا۔ اور غصہ حرام ہے۔ میرے ہاتھ ٹوٹیں میں نے اپنے بچے کو تھپڑ مارا۔ ان کا انتقال 1907ء کے موسم بہار میں ہوا۔ یہ میری زندگی کا پہلا صدمہ تھا۔ میری دادی حضرت نے ان کی میت پر ان کو بہن کر کے خطاب کیا اور خلاف رسم ان کا انتقال محل سرائے میں ان کے ٹھکانے پر ہوا۔ ورنہ مرنے کے لیے ہمارے ہاں کا قاعدہ تھا کہ چھوٹی حویلی میں جب حالت غیر ہوتی اور کوئی امید نہ رہتی تو بھیج دیتے تھے۔ میری دادی نے ان کا مرنا مثل اپنے عزیزوں کے کیا۔ پھول ،دسواں، بیسواں، مہینہ، چالیسواں، تماہی، چھ ماہی، تبارکیس عرفہ برسی اچھی طرح شہر کے رواج کے مطابق کیے اور اپنے تمام رشتہ داروں اور ملاپ داروں کو جمع کیا۔ ان کے نام پر خیرات کی۔ کنیا داں دیا اور ان کے حضرت خواجہ باقی باللہ میں درگاہ کے حصار کی جنوبی دیوار کے پاس جہاں میرے چھوٹے بھائی بہنوں کی سات قبریں تھیں انہی کے برابر دفن کیا۔ قبر پختہ بنوائی اب سب کھد کھدا کر برابر ہوئی اور دوسری قبریں وہاں بن گئیں۔ ستر اسی برس کی درمیانی عمر پائی۔ ہمارے ہاں پورے پچاس سال رہیں۔ قدیم اساتذہ کا کلام خوب یاد تھا۔ کہاوتیں تو نوک زبان تھیں۔ کہانیاں ایسی عمدہ طرح سے کہیں کہ سن کر ہزاروں نئے لفظ یاد ہو جائیں۔ چائے نمکین پیا کرتیں اور اس میں باسی چپاتی اور ملائی ڈالا کرتیں چائے کو رے آبخورے میں پیتیں ہری مرچیں بہت کھاتیں۔ چنوں کا چورن بنا کر کھاتیں جاڑے میں اور کیاں کھانے کے بعد ضرور کھاتیں۔ گو یندے جو دوسرے گھرانوں کی اچھی بری خبریں آ کر صبح سنایا کرتے اس کو گناہ سمجھتیں اور وہاں سے ٹل جاتیں۔ پان کی بڑی شوقین تھیں۔ پان دیسی کھاتیں اور زردہ امانت خانی، چھالیہ کا باریک چورا گھر میں ان کے لیے سینت کر رکھا جاتا پن کٹی میں پان کوٹ کر چمچے سے کھایا کرتیں۔ سونچ کر لکھنے بیٹھو اور ان کے اطوار اور طریقے بیان کرو تو ایک چھوٹی سی کتاب ہو جائے۔

☆☆☆

آغا حیدر حسین مرزا

مضمون

اردو محاورے

اچھا گھر ہے بیعانہ دو مرزا حسنو کا بیاہ وہاں کرادو۔ ہم وہ ایک ہی کفو کے ہیں ایک صاحب نے کہا اللہ، مبارک، ساز گار کرے۔ ساس بری باس، معاف کرو میں نے کبھی ساس کو ساس نہ سمجھا۔ اور ہمیشہ اماں جان کہا۔ اور ماں سے زیادہ چاہا۔ دل سے خدمت اور اطاعت کی۔ ناز کرنے ڈری۔ دوسری مصاحب بولیں۔ چکی تلے پوسیرا نکل ساس گھر میرا۔ سرکار چھوٹی حویلی میں رہنا پڑے گا یہاں ان کا عملہ دخلہ ہوگا۔ اس آرزو پر اس محل کو لیے بیٹھی ہوں کہ اپنی زندگی میں بیٹے کا گھر کر کے بہو کے حوالے کروں ۔ مجھے اب سوائے ان کی خوشیاں دیکھنے کے اور کونسی تمنا رہ گئی ہے۔ ایک چرکی ساس نے بہو کنواری انے ساس واری۔ بہو کی آئی سواری ساس کو پڑ گئی خواری۔ وہ خواری تم جیسی دہانہ بانی منڈو پھرے اترانی کی ہوتی ہے اپنی عزت اپنے ہاتھ ہے۔ مجھے کوئی قیامت کے بوریئے سمیٹنے ہیں۔ نہ رہے مان نہ رہے من۔ آخر دنیا فنی۔ میں تب سب کاروبار ان کے حوالے کر کے نچنت ہو کے اپنے اللہ کی عبادت اور ان کی سب کی دعا گوئی میں بسر کروں گی۔ دوسری نے چھیڑا۔ تیرا بیٹا مجھے، مزوڑے لگے تجھے درخشندہ زمانے نے مسکرا کر جواب دیا۔ کہہ دوں گی مجھے مڑوڑے نہیں لگ رہے ان سدا کی دکھی بختاور نام کو مزوڑے لگ رہے ہیں کیوں یہ حرم بننا چاہتیں تھیں۔ تیسری نے کہا جب بغل میں تمہارا اسپیارا تپ پوت تھا تمہارا جب ہاتھ ہوا کٹارا تب بنا دھنی ہمارا۔ بیشک اس میں کیا شبہ ہے جب تک بچہ تھا میں نے پڑھوایا لکھوایا پالا پوسا میری تو یہی دعا تھی کہ وہ تمہارا شوہر ہو کے جیئے۔ میں کب چاہتی تھی کہ ان غریب کی جورو عمدہ خانم نام کا خصم بنے۔ بہو بیگم تم میری مصاحب عمدہ خانم سے اپنے میاں کو بچا کر رکھنا۔ چوتھی ٹپک پڑی کہ پھرے تو ایلی گیلی کیا مٹکاوے کو لہا۔ ڈولے میں سے جب اتروگی الگ کروں گی چولہا۔ میں تو پہلے ہی سے باورچی خانہ الگ کردوں گی اور تمہارے سلگنے کو باورچی خانہ کی دروغن تم کو ہی بنوا دیں گی۔ پانچویں سنکاری مان بہن کو الگ بیوی کلیجی کی رگ، میں کہوں گی بہو بیگم تمہارے منہ میں موتی الٰہی تم کلیجے کی رگ، دل کی ٹھنڈک بنی رہو۔ اور آمین تم سے کہلواؤں گی۔ بی آمنہ بیگم ایک منہ چڑھی مصاحب یوں ہنس بولی۔ بیگم صاحب عالم، اللہ رکھو یہ کہنے لگیں گے۔ جہاں بیٹھے مان بیڑا کرے لبان لبان۔ جہاں بیٹھے زن بیڑا کرے دھن دھن۔ اے تو بی کونسی بات اس میں اس بچے نے غلط کہی۔ میرے سامنے تو جب آئیں گے ادب سے خاموش آئیں گے۔ اور بیوی سے ہنسی دل لگی۔ ہاہا ہو ہو ٹھی ٹھا ٹھا۔ پھر محل میں کیوں نہ قہقہے چہچہے ہوں اور تمہارے کلیجے پہ سانپ لوٹیں گے۔ کیوں تم وہاں کیسے بیٹھ سکو گی۔ تمہارا تو ساس کی مصاحب ہی سمجھ کر لحاظ کیا جائے گا۔ وہ کیا بیچاری جانے گی کہ تم کسی اور ہی فکر میں تھیں۔ سہاگ سیج میں ساجھا لڑانا چاہ رہی تھیں۔ اس جھکے کی ساتویں سہیلی یہ کہہ اٹھی کہ بیگم صاحب چاہے کتنی ہی بہو کی خوشامد کریں، وہ اللہ کی بندی بتائے گی نہیں۔ آپ چاہے جتنی بھی عاجزی کریں وہ پسیجگی نہیں۔ آپ ان کی دولہن سرکار میں عرضی بھی گزاریں گی تو عرضی پر بڑی سوکھی تجویز ہوگی۔ جا کہیو اس نبڑی کو جو حق دلائے امڑی کا۔ دوں گی حق مادری، وہی وہی سوا سیر باجری، حضرت مجھے بھجوائیں گی اور عرض کرائیں گی کہ دولہن جانی اپنی امی جان کا حق دلا دو۔ دولہن بیگم وعدہ فرمائیں گی کہ بے شک میں حق مادری میں سوا سیر باجری دونگی اور اس گھٹیا اناج کے دے دینے سے اپنے حق سے سبکدوش ہو جاوں گی۔ درخشندہ نے کہا اے ہے ہماری کہاوتیں کیسی ہیں کہ خواہ مخواہ ساس بہو میں بیر ڈلوادیں۔ بچپن سے ایسی باتیں کانوں میں پڑتی رہتی ہیں۔ اور وہ دل و دماغ پر اثر کرتی

رہتی ہیں۔ ساس بہو کوانہیں مشلوں کی اوٹ سے جھانکتی ہے اور بہو انہیں کہاوتوں کے گھونگٹ میں سے ساس سسرال کو دیکھتی ہے۔ کہیں نند بجلی بسنت ہیں اور کہیں بی نند محرم کے بند ہیں۔ اور کہیں نام نہ جانو تیرا تو جھیڑا میرا۔ کہیں ساس اپنے کی گھاس، سسرا دری کا پھسرا اور دیورانی باقی جانی ہیں اور کہیں یہ ہوتا ہے کہ بہو نے کہا جی ساس نے جواب دیا نکلا تیرا جی۔ بیٹی نے جو کہا ہوئے تو فرمایا۔ ایسا سہاگ سب کوئی کا ہوئے۔ مت کر ساس برائی تیرے آگے بھی جائی۔ بہو نے سلام کیا ساس نے دعا دی۔ نند جئیں نندوئی جیئیں نند کے ساتوں بچے جئیں خیر بچی تو بھی جی۔ ایسی باتیں اور ایسے برتاو ساس کا دل بہو کی طرف سے اور بہو کا دل ساس کی طرف سے پھاڑ دیتے ہیں جو ساس بہو میں اس کا خیال رکھیں گی وہ ایک دوسرے کو ماں بیٹیوں سے زیادہ چاہیں گی۔ اور نہیں تو جوتیوں میں دال بٹے گی اور بڑوں کے نام پنے اور گڑے مردا کھیڑے جائیں گے۔ اونی جانی اونی مانی۔ اونی بیاہن آئے۔ واہ رے نائی کے تو نے اوت ہی اوت سلائے۔ ساس طعنہ دے گی۔ جیوے میری بالکی جس نے باپ چڑھایا پالکی۔ نند مہینے دے گی جس کی بو اندر اس کا نصیبہ سکندر۔ جٹھانی جہیز پر لولیاں چھاٹیگی۔ ہاتھ نہ گلے پاوں میں پیاز کی ڈلے۔ بیاہ نہ پہنی بالیاں منکاوے گھونگر والیاں۔ ایک دیورانی نے پھبتی کسی۔ پھریانہ ساری بٹوی سو بھا ہماری۔ دوسری نے آوازہ کسا پیو ہمارے اندھے، کس پر کروں سنگار۔ ایک ایک کی سن سن کے بہو کا کلیجہ چھلنی ہو گیا۔ کب تک چپ رہتی۔ جون جون برداشت کی۔ چپ سادھی گنی بہو کا خطاب ملا۔ میاں سلامتی سے اس مزاج کے۔ کہ بولی تو بی بی میری نہیں تو درکار بھی نہیں تیری۔ بچاری دلہن اس نتیجے پر پہنچیں کہ شرم کی بہو، نت بھوکی مرے۔ آخر بہو نے بھی گھونگٹ بڑھایا۔ اور پہلے میاں کو نوازا بس کر میاں، بس کر میں نے دیکھا تیرا لشکر۔ اپنی برات کا خیال کہ سسرال سے کس طرح بہانے چڑھی تھی اس کی یوں ہجو کی۔ مان بیٹی گانے والی۔ باپ پوت پرانی اور پھر چنو الا کر کہا کہ نائی کی برات میں سبھی لٹا کر۔ ایک ایک سمدھی آہاہا کس سج دھج کا کہ صدقے قربان۔ واہ وا میاں بانکے تیرے دگلے میں سرسوٹا نکتے۔ دیکھ میاں کے چھند بند، پھاٹا جامہ تین بند۔ کبھی کنواری نند کے پیام کو چٹکیوں میں اڑایا۔ کہ ایسا ویسا بہاوے نا خان مملوک آوے نا بیاہی نند کو یوں بولی چھانٹی لاڑ میں آئی ککڑی بل بل جاوے کوا۔ بھلا نندوئی کیسے بجتے۔ کہہ ہی دیا لڑکا جنی پیٹی باندھیں میاں۔ جٹھانی کو کہہ سنایا۔ ٹاٹ کی انگیا مونچ کی نی کھوڑ پورا میں کیسے بنی۔ چچیا ساس کا یوں خاکہ اڑایا پردے کی بوبو چٹائی کا لہنگا۔ دیورانی کا دل یوں توڑا۔ مسی کا جل کس کو میاں چلے بھس کو۔ میاں یوں کو دا گھر میں نہیں تاگا۔ البیلا مانگے پاگا پھپیا ساس کو یوں کہا۔ ساس کی چیری سب کی جھیڑی۔ چھونے دیور کو یوں نوازا۔ مان پہناری باپ کنجر۔ بیٹا مرزا سنجر۔ یہ نہ ہو کہ سن لے ڈھول بہو کے بول ساس سرال میں پھونک پھونک کے قدم رکھنا چاہیے۔ اور ہر ایک کو پرچار کر اپنا کر لینا چاہیے۔ کوئی یہ نہ کہے کہ بہو نہ بولی نہ بولی بولی تو پتھر کھینچ مارا۔ منہ دکھائی کے بعد کوئی یہ نہ کہہ اٹھے کہ دیکھئے دیدار ماریئے پیزار۔ یا کوئی جی جلا یہ کہہ اٹھے۔ گدڑی سے بیوی آئیں شیخ جی کنارے ہو۔ اصل یہ ہے کہ بیاہ بور کے لڈو ہیں۔ کھائے تو پچتائے نہ کھاوے تو پچتاوے۔ کنواری ارمان بھری بیاہی پشیمان۔ شادی تک لڑکیوں کو ارمان رہتا ہے شادی کے بعد جان خلجان میں پڑ جاتی ہے۔ جو ماں باپ لڑکیوں کو مچھلیاں سمجھتے ہیں کہ رہیں اور بیسن یا آٹے نے چراغ ہیں کہ اندر رکھو چوہا کھائے باہر رکھو کوا لیجائے۔ اور جلدی سے اپنے سر کی بلا اور کندھوں کا بوجھ سمجھ بیاہ دیتے ہیں اور جانتے ہیں کہ چلو ہلکے ہو گئے۔ تو سمجھ لیں کہ کنواری کھائے روٹیاں اور بیاہی کھائے بوٹیاں۔ گھر کے بگڑے خمیر کو جب گھر والے نہیں سنبھال سکے تو پرایا جاتا کیا۔ سدھار گیا۔ اور کیا اپنا ہوگا۔ جار جنوائی بھانجا یہ تینوں نہیں اپنا۔ گھر داماد رکھو تو ہر وقت کی سوختی سامنے۔ سمدھیانہ پیخانہ دور بھلا۔ اگر بیٹی کی ماں پی تو داماد کا دل ٹوٹا اور جو داماد کی طرفداری کی دھن چھوڑ داماد پیارا کہہ گھر والوں نے ٹوکا۔ بیٹی داماد کے جھگڑوں میں دخل ہی نہ دینا چاہیے۔ بیچ کے چلے جائیں گے۔ کام دلہا سے میاں بیوی کا نکٹ

رشتہ ہے۔اور آپس کی شکر رنجی کہنی کی چوٹ کہ جھر سے ہو رہ گئی۔ یہ رشتہ ہی لڑائی کا ہے۔ اوپر تلے کی بہن بھائی لڑتے ہیں۔ یہ تو میاں بیوی ہیں ان کے جھگڑے میں پڑنا ہی نہ چاہیے۔ دلہا دولہن مل گئے۔جھوٹی پڑی برا۔ یا یوں سمجھ لو ساجن ساجن دھڑ ملے اور جھوٹے بڑے جیٹھ۔کبھی لڑتے ہیں کبھی ملتے ہیں کبھی برائی کرتے ہیں کبھی تعریف کافی لوکون سرائے کافی کامیاں۔ ہشیار لڑکیاں میکے سے زیادہ سسرال کو اپنا کر لیتی ہیں۔ گھر چھوڑ صفرا قایم۔لیکن ایسی بھی حد نہ کر دینی چاہیے۔کہ سالے کے سسرے اور سسرے کے لڑ دھون دھون کہ کوئی یہ نہ کہہ اٹھے نند کے نندوئی کلے لاگ کے روئی اور نہ یہ ہونا چاہیے کہ روٹھ کے کہاں گئی کہ سوت کے پہر۔

اپنی ساس کو ماں سے زیادہ سمجھنا چاہیے۔ کہ وہ کہے سلامت رہے بہو۔جس کا بڑا بھروسہ۔ یہ نہیں کہ ساس گھر سے باہر ہوئی اور گھر کا گھر وندا ہو گیا۔ ساس گئی گاون بہو کہے میں کیا کیا کہاوں۔ یا گھر میں جمی جم ہے لیکن بہو کی ہوس کی کوئی حد نہیں کہ ساس کو نہیں پہنچے بہو چاہے تنبو اور سرا پہنچے۔ ہوے کی جوت ہے جتنی چادر دیکھے اتنا پاوں پھیلائے۔ بیویوں کی چترائی اس میں ہے کہ وہ اپنی آمدنی کو ایسی خوبی اور خوش اسلوبی سے خرچ کریں کہ دیکھنے والوں کو سو کا خرچ ہزار معلوم ہو۔بعض چونچل مستیاں میاں کی ذرا سی اس توجہ سے اتر اجاتی ہوں۔کہ کھائی تھی گاجر مارنی تھی پیندی شیخی بگھاریں پھرتی ہیں۔اگر کو تو م چھلا خصم نے بنوا دیا تو ایک ایک جگہ نچاتی دکھاتی پھرتی ہیں۔ اچھی بھاری بھرکم بیویاں وہ ہیں جو سونا پہنے ڈھک چلے اور بیٹا جنے جھک چلے۔ یہ کیا اترا آہٹ اور اس میں کیا ملاوٹ کہ سیان کے برتن بھیا کے کا ناران پہن اوڑھ میں سسرال جاوں۔اس نمود کا انجام طعنے سننے اور مہنے سہنے سوں کہ چپر میری پالکی جن باپ چڑھایا پالکی۔ یاس کس نے بھائی کا طعنہ دیا کہ جس کی باونڈ را اس کا نصیبہ سکندر۔ اور نہیں تو یوں تنبیہ کی۔ کہ گھر کھوئے سالا اور کھیت دیوے نالا۔سرال میں جو منہہ سے نکلے سو نچ سمجھ کے نکلے۔کیوں کہ زبان جنے ایک مار مانجے بار بار پکانے رینڈھنے کا انتظام ہونا چاہیے۔ کہ کوئی یہ نہ کہہ سکے کہ کونے نے دیا ٹکڑا میرا گیا بھکڑا۔ خانہ داری کا سلیقہ ہو۔ جو کوئی یہ نہ کہنے پائے کہ تن لگی دھپڑی بلا بھائے بھپڑی۔ یہ نہیں کہ میاں کو الہنا دیا جا رہا ہے کہ جیسا تیرا نوں پانی ویسا میرا کام جانی۔ بایون کلیجے میں چٹکی لی تیلی خصم کرنا اور روکھا کھانا ادھر میاں نے تڑ سے جواب دیا کہ گال والا جیتے مال و الا ہارے۔اے لو شروع ہو گئی۔ لوگوں کو ہنسنے کا موقع ہاتھ آیا۔جس مکندنس ہاتل گھوڑی بدھنا آن ملا دل جوڑی۔ دنیا ند خصم کو چھوڑے نہ جورو کو بخشے۔کس نے یوں انصاف کیا کہ (لائیکا دارا تو کھائے گی۔ داری نہ لائے گا دارا تو پڑے گی خواری) بیوی نے اپنا پیچھا یوں کہہ کے چھڑایا کہ سب کچھ گیا میاں کی ٹخ ٹخ نہ گئی۔اس آئے دن کی کل کل کی خبر میکے پہنچی۔ لوگوں نے پوچھنا شروع کیا کہ کیا دیکھا کے بیٹی کو جھونکا۔ ماں باپ بیچارے حیران کہ ایک تو کانڑی بیٹی بیاہی دوسرے لوگوں نے پوچھ پوچھ کھائی۔کس کس کا جواب دیں کس کس کو سمجھائیں دنیا بیکار ہے۔ دوسرا کام ہی کیا ہے سوائے اس کے کہ دوسروں کے گھروں کی ٹوہ لیں ہلکی کیا جانے پرائی دل کی جی ہی جی میں کھول کے رہ گئے۔اگر شرما کے چپ رہ گئے تو کہنے والوں نے کہہ ڈالا کہ مانگ جانچ کے لیے جہانجا مانگ لیں تو آئے لا جا۔ نہ صورت نہ سیرت منہ نور نہ پیٹ صور۔ جو بو جان کے پرائی جائی کو کیوں لا کے جلایا۔دلوں تو بات اٹکائے رکھی کہ مان بیچاری سہر کی آرزو لے اللہ کی پیاری مرئی سارے جہاں میں ڈھونڈی پھری کہ موٹی مائی ٹوٹی سگائی۔ اللہ اللہ کر کے سہرے کے پھول کھلے۔ جوڑا عرش سے اترتا ہے کہ ماں باپ کریں نان نان تقدیر کرے ہاں ہاں۔ آخر ہو کے ہی رہی۔ یہ جھگڑے ایسے ہیں کہ ساری عمر ختم نہ ہوں گے۔ یہی رونے گھر گھر ہیں۔محلوں کے حویلیاں اور حویلیوں کے گھر اور گھروں کے کھنڈے کھنڈیوں کے جھونپڑے بھی نہ رہے۔ اس گھر کی بیراکھیری نے سارے ملک میں پھوٹ پھیلا رکھی ہے۔گھر میں سلوک ہو تو ملک کے دن پھریں۔الٰہی سب کے دلوں کو پاک کر اور ملوا دے۔آمین ثم آمین۔اللہ حافظ

آغا حیدر حسن مرزا

کہانی

کتّے کی کہانی

ہمارا تمہارا خدا بادشاہ خدا کا بنایا رسول بادشاہ۔ ایک بادشاہ تھا۔ اس کی ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ صبح کی نماز پڑھ کر تلاوت کر نے بیٹھ جاتی۔ ایک کتا روزانہ آتا اور جب تک وہ قرآن شریف پڑھتی، تخت کے نیچے بیٹھا سنا کرتا۔ بادشاہ زادی سیانی ہوگئی اور کہیں سے کوئی پیغام نہ آیا۔ ایک دن بادشاہ سلامت کے جی میں کیا آئی فرمانے لگے۔ کہ شہزادی کے لیے کوئی بر نہیں ملتا۔ اگر کل تک کوئی پیغام نہ آیا تو اس کتے ہی سے اس کا بیاہ کر دیا جائے گا۔ اللہ کا کرنا کیا ہوا کہ کوئی بر نہ ملا۔ بادشاہ نے کہا کہ کتّے کل شہزادی سے تیرا نکاح ہے۔ شام ہوئی، تو کیا دیکھتے ہیں خوانوں، کشتیوں سینیوں کی ایک لنکتار چلی آتی ہے۔ سونے روپے کی کشتیاں ہے۔ کارچوبی کشتی پوش، موتیوں کی جھالریں ٹکی۔ ہزاروں لاکر رکھ دی گئیں۔ لیکن کوئی لانے والا نظر نہ آیا۔ محل میں رکھنے کو جگہ نہ رہی۔ اندر باہر سانچق کے سامان سے سب بھر گیا۔ سونے چاندی کی ٹھلیاں کسی میں دہی کسی میں شربت بھرا۔ منہوں پر سونے چاندی کی چینیاں ڈھکی۔ لال لال کارچوبی صافیاں کلابتونی ڈوریوں کسی۔ جڑاو مچھلیاں گلوں میں پڑی۔ سہاگ بڑا سات بادشاہت کے مول کا ایک ایک جواہر ایسا کہ نہ بادشاہوں کی نظر پڑا نہ جوہریوں نے دیکھا۔ محل والیاں امیر وزیر اور رعایا برایا جو بادشاہ کے اس حکم سے روپیٹ رہی تھی کہ ہمارے بادشاہ کو کیا ہوگیا کہ شہزادی کی شادی کتے سے کر رہا ہے۔ یہ تزک احتشام کروفر دیکھ کر سب کے سب بھونچکا رہ گئے۔ بچاری شہزادی کا عجب عالم غش پہ غش آئے۔ گلاب اور بید مشک چھڑکے جاتے لخلخے سنگھائے جاتے لیکن شہزادی سامانوں میں نہ آتی۔ شادی کی تاریخ پر ٹھیک وقت کیا دیکھتے ہیں کہ وہی کتا جواہرات اور پھولوں کا سہرا بندھا طرہ لگا۔ بدھی پڑی خراماں خراماں چلا آتا ہے۔ باجے گاجے گانے بجانے کی آوازیں ساتھ چلی آتی ہیں۔ لیکن گاتا بجاتا کوئی نظر نہ آتا۔ دنیا حیران کہ الٰہی یہ کیا طلسم ہے کہ نہ دیکھا نہ سنا۔ شہزادی کا نکاح ہفت اقلیم کے بارہ سال کے خراج پر بندھا۔ بادشاہ سلامت نے بھی اپنی شان کے مطابق قسم قسم کے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ، خچر ملک ملک کے لونڈی غلام دیس دیس کی عجوبہ چیزیں، غرض کوئی چیز ایسی نہ رہی جو بیٹی کو نہ دی ہو۔ سارا دان دہیز بار کرا۔ بیٹی کو رخصت کیا۔ آگے آگے کتا۔ پیچھے پیچھے شہزادی کا مہاڈول اس کے پیچھے جہیز کی قطار۔

شہر سے باہر نکل کتّے نے جنگل کا رخ کیا خلق خدا حیران کہ الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔ چلتے چلتے لوگوں کے پاؤں تھک گئے۔ اور چپکے چپکے سے سامان پھینک شہر کو واپس ہونے لگے۔ کہار بھی چلتے چلتے تھک گئے۔ اور لگے شہزادی کا مہاڈول زمین پر دھرنے۔ ایک دم کتّا بھونک کران کی طرف لپکا۔ کہاروں نے ڈر کر جلدی سے اٹھایا اور پھر لگے چلنے۔ جب کہار مہاڈول رکھنے کا ارادہ کرتے۔ کتا بھونک کر کاٹنے آتا وہ ڈر جاتے اور روتے چلے جاتے تھے۔ چلتے چلتے پاوں سوج گئے۔ چھالے پڑ گئے۔ آخر ایک جگہ مہاڈول پٹخ دیا۔ اور شہر کی طرف بھاگے کتا غائب ہوگیا۔ مہا ڈول میں شہزادی، بیہوش پڑی۔ اس کی دوا حلق میں پانی ٹپکاتی۔ پنکھا جھیلتی۔ جب شہزادی ذرا آنکھ کھولی تو دوا کی جان میں جان آئی۔ شہزادی کو سمجھانے لگی۔ شہزادی نے پردے میں سے جھانک کر دیکھا چاروں طرف جنگل ویران۔ سناٹا آدم زاد کا نشان نہیں۔ اندر بیٹھے بیٹھے دادا کا دم گھٹنے لگا۔ وہ پردہ ہٹا مہاڈول سے باہر نکل۔

بیٹھی دل پریشان تھا۔بیٹھی بیٹھی زمین کریدتی تھی کہ کیا دیکھتی ہے۔ سونے کا ایک خلابہ ہے۔اس نے مٹی ہٹائی تو سنگ مرمر کی ایک سل نظر آئی۔ دوانے قلابہ پکڑ کر کھینچا تو کیا دیکھتی ہے۔ سنگ مرمر کی سیڑھیاں ہیں۔ جواہرات کی پچکاری ہے۔ جلدی سے شہزادی کو مہا ڈول میں سے نکالا۔ دونوں ڈری سہمی سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگیں۔ کیا دیکھتی ہیں کہ یک مرصع ایوان ہے جھاڑ فانوس، کنول مردنگ ، ہانڈیاں دیوار گریاں لگی ہیں۔ پٹا پٹی کے پردے چھٹے ہیں۔سونے کے تخت پر مسند تکیے لگے ہیں۔ایک طرف چھپر کھٹ لگا ہے محل فرش فروش سے آراستہ ہے۔ انگیٹھیوں میں خوشبوئیں روشن۔لیکن آدمی کا پتہ نہیں۔شہزادی اور اس کی دادا حیران پریشان ڈری جاتیں کہ اتنے میں شام ہوگئی۔سارے محل میں آپ سے آپ ایک روشنی ہوگئی اور تھوڑی دیر میں دو بڈھے ایک سو برس کا دوسرا سوا سو برس کا آتے دکھائی دیے۔ ادب سے مجرا عرض کیا۔ اور دسترخوان بچھا سونے روپے کے جڑاو باسنوں میں خاصہ چن دیا۔ زیر انداز پر سونے کا سلفچی آستانہ لگا بیسن دانی اور کھلی دانی رکھ دی۔ہاتھ دھلوا دست پاک سے ہاتھ پچھوا مسند پر شہزادی کو بٹھا زانو پوش ڈال پاس بنی پاک رکھ دیا۔سامنے دوا بھی دسترخوان پر بیٹھ گئی۔کھانے پر فارغ ہوئے۔ہاتھ منھ صاف کیے۔خاصیدان سے گلوریاں کھائیں۔ بڈھوں نے ادھر ادھر کی باتیں کیں۔شہزادی اور دادا کو تسلی دی۔اور جانے کی اجازت چاہی چلتے وقت دو گل دستے ایک شہزادی اور ایک دادا کو دیا۔ان دونوں نے سونگھا اور سونگھتے ہی اپنے اپنے پچھونوں پر لیٹ گئیں۔اور بیہوش ہوگئیں۔دوسرے دن پھر صبح آنکھ کھلی تو نماز پڑھ کر تلاوت میں مشغول ہوگئیں۔غرض وہ دونوں سو سو برس کے بڈھے روز آتے۔کھانا کھلاتے اور رخصت ہو جاتے۔ چلتے وقت گلدستے دیتے اور یہ دونوں سونگھتیں اور بیہوش ہو جاتیں۔اسی طرح ہوتا رہا۔ایک دن کیا ہوا کہ دادا کو خیال آیا۔کہ یہ بڈھے جو پھول ہمیں سونگھنے کو دیتے ہیں اس کو سونگھتے ہی ایسی ہم پر کچھ غفلت طاری ہوتی ہے کہ ہاتھ پاوں کی تک سدھ نہیں رہتی آج یہ دستے تو سونگھوں گی نہیں۔ یہ ارادہ دل میں پکا کر کھانے کا انتظار کرتی ہیں۔ جب کھانے سے فارغ ہوئے۔اور بڈھے رخصت ہونے لگے۔تو حسب معمول سونگھنے کو پھول دیئے۔شہزادی نے تو سیدھے سونگھ لیا۔اور بیہوش ہو چھپر کھٹ پر جا لیٹیں۔لیکن دادا نے سانس روک ناک کو لگایا۔اور بیہوشی کا بہانہ کر اپنے بستر پر جا پڑی۔ دونوں بڈھے چلتے بنے۔ جب تک ان کے پاوں کی چاپ سنائی دیتی رہی یہ دم سادھے پڑی رہی۔لیکن جب قدموں کی آہٹ آنی موقوف ہوئی تو اپنے بستر سے اٹھ بیٹھی۔اور ادھر ادھر دیکھنے لگی۔اور پھر بارہ دری کا پردہ اٹھا باہر نکلی کیا دیکھتی ہے کہ چاروں طرف باغ لگا ہے۔یاقوت کی روشیں ہیں۔بلور کے حوض اور سنگ مرمر کے نہریں ہیں۔زمرد کی جدریس اور ہیرے کے فوارے ہیں۔گلاب اور کیوڑہ پڑا چھوٹ رہا ہے۔گونا گوں میوہ لدا ہے۔کوئلیں کوک رہی ہیں۔ مور چھنگاڑتے ہیں۔بلبل ہزار داستان اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔ دواروشوں پر چہل قدمی کرتی ادھر اُدھر پڑی پھرتی تھی کہ کیا دیکھتی ہے۔باغ کی دیواریں نیلم کی چوکھٹ ہے اور یشب کے کیواڑ ہیں۔ یہ کھول باہر ہوئی تو ایک لق ودق میدان نظر آیا یہ حیران ایک طرف کو کھڑی تھی کہ اتنے میں سقے آئے۔ چھڑکاو کر گئے۔خاکروب ستھرائی دے گئے۔فراش آئے۔فرش بچھا گئے۔ مشعلچی آئے۔مشعلیں روشن کر گئے۔تھوڑی دیر میں آسمان سے تخت اترنے شروع ہوئے۔ بیچوں بیچ ایک شہزادہ تخت پر بیٹھا چندے آفتاب چندے مہتاب حضرت یوسف بھی دیکھیں تو ایک جان سے ہزار جان عاشق ہو جائیں اور بن داموں ہاتھ بکنے کو تیار ہو جائیں۔شہزادے کی ہوں کے ساتھ ہی ساری پریاں ناچنے لگیں۔ جیسے ہی صبح کو پو پھٹی مرغ نے اذان دی تارے جھلملائے

اوراوس کی بھیگی بھیگی ہوا۔منہ پر آنے لگی۔شہزادے نے ہنکارا بھرا۔ جلسہ موقوف ہوا۔شہزادہ تخت سے اتر خراماں خراماں باغ کی طرف روانہ ہوا۔ددا نے جو یہ دیکھا تو پتہ توڑ پیاں پیاں بھاگی۔اور اپنے بستر پر جادم سادھ پڑ رہی۔

جب صبح ہوئی اور شہزادی بیدار ہوئی تو ددا نے کہا کہ صدقے جاوں قربان جاوں آج جو بڈھے گلدستے پیش کریں۔ سونگھئے گا نہیں بہانہ کر کے آرام کر کے لیٹ جایئے گا۔جب سوا سو برس کے بڈھے آئے اور شہزادی خاصے سے فاغ ہو چکی، بڈھے رخصت ہونے لگے۔شہزادی کے سامنے پھول پیش کیا۔شہزادی نے سونگھنے کا بہانہ کیا اور بن کر لیٹ گئی۔جب بڈھوں کے پیروں کی آواز آنی بند ہوئی اور شہزادی کو اطمینان ہو گیا۔آہستہ سے اٹھی اور بارہ دری کے باہر نکلی۔ چاروں طرف خوب صورت باغ ہے۔صاف صاف روشیں ہیں۔حوض کٹورا سے جھلک رہے ہیں۔ نہریں جاری ہیں۔کیوڑے کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔گونا گوں میوے لدے ہیں۔کوئلیں کوک رہی ہیں۔مور چھنگاڑ رہے ہیں۔بلبل ہزار داستان اپنی اپنی بولیاں بول رہے ہیں۔طرح طرح کے پھول کھلے ہیں۔شہزادی باغ کی سیر کرتی دروازے کے پاس پہنچی اور کیواڑ کھول باہر نکلی۔ایک وسیع میدان نظر آیا۔تھوڑے دیر میں کیا دیکھتی ہے۔ستے آئے چھڑکاو کر گئے۔خاکروب آئے جھاڑو دے گئے۔فراش آئے فرش بچھا گئے۔ مشعلچی آئے مشعلیں روشن کر گئے۔پھر آسمان سے تخت آئے۔بیچ میں شہزادہ۔چاروں طرف پریاں تا تا تھئی، تا تا تھئی، خوب ناچ ہوا۔گانا ہوا، جب مرغ نے اذان دی اور صبح کی پوپھٹی، شہزادہ تخت سے اٹھ خراماں باغ کی طرف روانہ ہوا۔شہزادی جلدی سے جلدی بھاگ چھپر کھٹ پر آنکھیں بند کر لیٹ رہی۔شہزادہ آیا کافوری شمع اٹھائی اور شہزادی کا منہ دیکھنے لگا۔تھوڑی دیر میں سکھ سیج پر سکھ فرمانے لیٹ گیا۔آنکھوں میں نیند گھلنے لگی اور فوراً آنکھ لگ گئی۔

شہزادی کو جب اطمینان ہو گیا کہ شہزادہ گہری نیند سو گیا ہے۔آہستہ سے اٹھی اور دل میں کہنے لگی۔کہ روز یہ میری صورت دیکھتا ہے۔آج میں اس کی صورت جی بھر کے دیکھوں۔یہ کہ کافوری شمع اٹھائی اور چہرے کی طرف جھکائی ہوئی شدنی شمع کا پھول شہزادے کے چہرے پر گرا۔اور وہ چیخیں مارتا۔ہائے جلا۔ ہائے مرا چلاتا آسمان پر اڑ گیا۔اس کا اڑنا تھا کہ جھاڑ فانوس ہانڈیاں کنول دیوار گیریاں چھنا چھن گرنے لگے اور ہر دنگ قمقمے حباب چٹخنے لگے۔دیواروں میں لونی لگ گئی۔حوض پٹ گئے۔ نہریں اٹ گئیں۔باغ جل گیا۔محل اجڑ گیا۔جہاں بلبل ہزار داستان بولتے تھے وہاں الو بولنے لگے۔جہاں گونا گوں میووں کے درخت لدے پڑے جھومتے تھے۔وہاں ٹہنی، تھوہڑ جھاڑ، جھنکار، ببول، ناگ پھنی، بھٹ کٹیاں، سانبر، ستیاناسی کی جھاڑیاں پیدا ہو گئیں۔بچھو کھنکھجورے، بڑا گوہی، چھپکلیاں اور اس میں رینگنے لگیں چھتوں سے جالے لٹکتے۔بگولے اور جھکڑ چلتے۔آندھیاں آئیں۔سارا محل گرد اباد۔چوطرف ریت کے تودے کے تودے۔ ڈراونی ڈراونی آوازیں سنائی دیتی۔ایک وحشت کا عالم شہزادی اور ددا۔بھی حیران پریشان کہ تھا کیا اور کیا ہو گیا۔شام ہوئی تو وہی دونوں سوسوا سو برس کے بڈھے آئے اور کھانا لائے کہنے لگے کہ شہزادی کسی ظالم نے غضب کیا کہ ہمارے شہزادے کو جلا دیا۔نہ اس کو دن چین ہے نہ رات کو آرام۔ایک چیخ زمین ہے ایک چیخ آسمان شہزادی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور بڈھوں سے کہا کہ اے سوسوا سو برس کے بڈھو! مجھے یہاں سے لے جا کر کہیں بیچ دو۔بڈھوں نے عرض کی شہزادی کیا فرماتی ہیں۔ہمارا شہزادہ سن لے گا تو ہمارا جن بچہ کو لہو پلوا دے گا۔شہزادی نے کہا کہ اب مجھے اس جگہ رہنا حرام ہے اور کھانا پینا بری بات۔اگر تم مجھے لے چل کر

نہ بیچو گے تو وہ بندی اپنی جان دے دیگی۔ بڈھے مجبور ہوئے اور شہزادی کو ساتھ لے کر چلے جنگل بیابان کف دست میدان ہیہات خدا کی ذات نہ کوئی پکڑن کو ہاتھ نہ پوچھن کو بات بھوک لگتی تو جنگل کی بناس پتی کھالیتی۔ پیاس لگتی تو ندی نالوں کے پانی سے بجھالیتی کہتے ہیں کہ رستے کی عمر کوتاہ چلنے والی کی عمر دراز۔ چلا چل چلا چل یک شہر کے قریب پہنچے۔ دیکھتے کیا ہے صاف ستھری چوڑی چوڑی سڑکیں ہیں بازار بھرے ہیں۔ کہ تھالی پھیکو تو سر پر چلے کندھے سے کندھا رگڑتا ہے پیدل، سواری والوں کا وہ تانتا بندھا ہے۔ کہ ایک طرف کی پٹڑی سے دوسری طرف جانا دشوار ہے۔ شہزادی اور دونوں بڈھے بچتے بچاتے نخاس میں پہنچے۔ اور بردہ ہے بکاؤ کو بردہ ہے بکاؤ کو صدائیں لگانے لگے۔ ایک سوداگر آیا۔ اور مول تول کر کے لے گیا۔ اپنی بیوی کے حوالے کیا سارے دن کوٹھی میں رہتا رات کو گھر آ کر تھک کر پڑا رہتا۔ شہزادی دن بھر ٹہل کرتی رات کو ایک جھلکتے کھٹولے پر پڑ رہتی۔ آنکھوں میں نیند کہاں کسی کی چٹک لگی ہو تو پلک سے پلک کیسے لگے۔ اپنے شہزادے کی یاد میں پڑی پڑی کروٹیں بدلا کرتی۔ ایک دفعہ دیکھا کہ سوداگر کی جورو چپکے سے اٹھی اور حمام میں گئی۔ حمام، پوشاک، بدل، سولہ سے سنگار بارہ سے ابرنگ، بال بال گج موتی پرد، بن سنور بیٹھ گئی۔ اور ایک تخت اڑتا ہوا آیا اور انگنائی میں اترا۔ سوداگر کی جورو بڑے ٹھسے سے اس پر جا بیٹھی، تخت پھراڑا شہزادی نے لپک کر اس کا پایہ پکڑ لیا۔ اور لٹکی ہوئی چلی گئی۔

تخت راج اندر کی سبھا میں جا اترا۔ راجہ اندر نے دیکھتے ہی سوداگر کی جورو کو موٹے موٹے بھوگ سنائے۔ کہ تو نے آنے میں دیر کی اور ہمارا مزا کرکرا کیا۔ اس سے ہاتھ باندھ کر عرض کی کہ جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں۔ راجہ اندر نے کہا کہ تیری جان تجھ کو بخشی کہہ کیا کہتی ہے۔ سوداگر کی جورو نے کہا کہ میرا سوداگر دیر میں گھر آتا ہے جب وہ سو لیتا ہے تو میں آتی ہوں۔ راجہ نے کہا کہ یہ زہر کی پڑیا ہے لیجا اگر اس پڑیا کو دریا میں ڈال دے تو پانی ہمیشہ زہریلا رہے۔ جو پیئے فوراً مر جائے۔ سوداگر کی جورو نے وہ پڑیا لی۔ آنچل میں باندھ لی۔ اتنے میں شہزادی نے جلدی سے اپنے ڈوپٹے کا منڈاسا بنا باندھ لیا۔ اور ایک طبلچی جو بیٹھا اونگھ رہا تھا۔ اس سے کہا کہ لاو ماموں مجھے دو۔ تم ذرا ارام کرو پہلے تو طبلچی نے کہا کہ جا بے لونڈے تو کون ہے۔ ذرا ٹھیکہ بگاڑ دیا۔ راجہ اندر ہمیں اندھے کنویں میں ڈلوا دے گا۔ شہزادی نے اسے ایسا باتوں میں لبھایا کہ وہ راضی ہو گیا۔ اب سوداگر کی جورو کا ناچ شروع یہ نرت کرتی گتیں بھرتی توڑے لیتی۔ اور شہزادی نے وہ ٹھیکا دیا۔ کہ سماں بندہ گیا پوری سبھا جھومنے لگی۔ راجہ اندر خوش ہو نو لکھا بارا تار سوداگر کی جورو کے گلے میں ڈال دیا اور سرور میں آ کر بولا کہ اکسیر کی پڑیا ہے۔ اس کا ایک خواص یہ ہے کہ اگر کوئی آدمی زاد کسی لاآدم آزاد کو کھانے لگے تو اس کی تین پڑیاں بنا ایک ایک کر اس کے منہ میں ڈال دیں تو وہ آدم کو کھانے چھوڑ دے۔ وہ سامنے طاق میں اس کی پڑیاں ہلا رکھی ہیں۔ شہزادی نے آنکھ بچا وہ پڑیاں اڑا لیں اور نیفے میں اڑس۔ جب صبح کا تارا افق پر ظاہر ہوا۔ پریاں اپنے اپنے ٹھکانوں کو اڑ گئیں۔ سوداگر کی جورو لا بھی اپنے اڑن کھٹولے پر آ بیٹھی۔ اڑن کھٹولا اڑا۔ اور شہزادی نے چھپک اس کا لا پایہ پکڑ لیا اور لٹکتی ہوئی سوداگر کی حویلی میں آ اُتری۔

سوداگر کی جورو نے چپکے چپکے جلدی سے پوشاک بڑھائی۔ اور اپنے پلنگ پر جا پڑ سو رہی۔ شہزادی بھی اپنے کھٹولے پر پڑی رہی۔ تھوڑی دیر میں صبح ہوئی شہزادی نے جھاڑو بھار ودی۔ گھر کا کام کاج کیا کہ اتنے میں سوداگر کی جورو اٹھی اور ہاتھ منہ دھو۔ ناشتہ تیار کر سوداگر سے بولی کہوں تو ماں ماری جائے نہ کہوں تو باپ کتا کھائے۔ سوداگر نے پوچھا کہ کیا کہتی ہے اس نے ہاتھ باندھ کر

چپکے سے کہا کہ ناشتہ جمی جم کرنا۔اس میں زہر ملا ہے۔آپ کی بیوی نے ملایا ہے۔سوداگر کو یقین نہ آیا۔ پاس کھڑی تھی بکری، ایک ٹکڑا اس کو ڈالا۔اس نے کھاتے ہی لہر بھی نہ کھایا۔اب تو یہ چوکنا ہوا۔ ایک کتا جا رہا تھا۔اس کو چکا کر ٹکڑا ڈالا وہ بھی کھاتے ہی چکرا کر پٹ سے گر پڑا۔ اب تو سوداگر کی آنکھوں میں خون اُتر آیا۔ اور شہزادی سے سارا واقعہ ڈانٹ کر پوچھا۔ اس نے ڈرتے مرتے شروع سے آخر تک سچ سچ سنا دیا۔سوداگر تلوار سونت گھر میں گیا اور جورو کو چورنگ کر دیا۔شہزادی سے کہا کہ آج سے تو میری بیٹی اور میں تیرا باپ اس بندے کی آل ہے نہ اولاد۔ یہ سب مال و متاع تیرا ہے جو کھلائے گی کھاوں گا۔ جو پہنائے گی پہنوں گا۔ بقیہ دن یاد خدا میں بسر کروں گا شہزادی نے کہا کہ میری ایک خواہش اگر آپ تین قول دیں تو عرض کروں سوداگر نے سوگندھ کے ساتھ تین قول دیئے تب شہزادی نے کہا کہ اس بندی کو آزاد کر دیں۔سوداگر قول سے بدل نہ سکتا تھا۔آنکھوں میں آنسو بھر لایا۔شہزادی کو آزاد کر دیا۔ شہزادی سوداگر کو روتا چھوڑ اجازت لے گھر سے نکل شہر کے باہر ہوئی۔

وہی سو سوا سو برس کے دونوں بڈھے پھر آ موجود ہوئے۔شہزادی نے پھر کہا کہ ائے سو سوا سو برس کے بڈھو! اس بندی کو لے چل کر بیچ آو۔ بڈھوں نے کہا شہزادی کیا غضب کی ہے۔ ہمارا شہزادہ سنے گا تو ہمارا زن بچہ کو لہو پلوا دے گا۔ بڈھے جتنا انکار کرتے شہزادی اتنا اصرار کرتی۔آخر کو مجبور ہو ساتھ لے چلے۔ چلا چل چلا چل ہو حق جنگل بیابان کف دست میدان۔آدم نہ آدم زاد نہ کوئی پکڑن کو ہاتھ نہ پوچھن کو بات۔شہزادی ننگے پاوں، تلووں میں چھالے پڑ پڑ کر ادھ موئے ہو گئے۔دو بنے سے دھجیاں پھاڑ پھاڑ پاوں کو باندھ کپڑے میلے چکٹ پھٹ کر لیریاں ہو گئے۔ بھوک لگتی تو بناس پتی کھا لیتے۔ پیاس لگتی تو ندی نالوں نے پانی اونک سے پی پیاس بجھا لیتے۔گرتے پڑتے چلے جاتے تھے سچ کہا ہے کہ رستے کی عمر کوتاہ چلنے والے کی عمر دراز چلتے چلتے ایک شہر میں پہنچے اور بڈھوں نے نخاس میں لیجا شہزادی کو ایک وزیر کے ہاتھ بیچ دیا۔

وزیر کے آدمی اس کو وزیر کے محل میں لے گئے اور ایک مکان میں بند کر دیا۔وہاں کیا دیکھتی ہے کہ بیسویں چھوکریاں ہیں۔ دو کہیں، بیٹھی ہیں چار کہیں بیٹھی ہیں۔ چہرے ملول ملول سے آپس میں کھس پھس، کھس پھس کر رہی ہیں۔شہزادی نے کہا بولو آخر ہے کیا بات ہم بھی تو سنیں، ان میں سے ایک نے کہا اے سننا کیا دیکھ ہی لوگی۔ایک لونڈی دھارم دھار رو رہی تھی۔دس پانچ اس کو سمجھا رہی تھیں۔ جب شہزادی نے بہت اصرار کیا تو ایک بولی بیوی آج اس کی باری ہے وزیرزادی کی خوراک میں یہ جائے گی۔وزیرزادی پر کسی دشمن نے ایسا کر دیا ہے کہ وہ آدم خور ہو گئی ہے۔ایک صبح ایک شام روز کھاتی ہے۔شہزادی نے کہا وئی اتی سی بات کا اتا غم۔ بوا تمھیں میری قسم آج اپنی باری میں مجھ کو بھیج دو۔تم نہ جاو وہ سب کہنے لگیں۔نہیں بہن یہ کونسا انصاف ہے۔تم آج ہی آئی ہو۔دو چار روز اور دنیا کی ہوا کھاو۔ پھر جانا تو ہے ہی بکرے کی ماں کب تک خیر منائے گی۔شہزادی نے بہت ضد کی۔ جب حبشی غلام ایک لونڈی کو لینے آئے۔تو شہزادی نے زبردستی ان کیساتھ اس کے بدلے میں ہو گئی۔وہ اس کو لے کر چلے اور ایک محل کے دروازے پر کھڑا کر کے کیواڑ کھول شہزادی کو اندر دھکیل دیا جیسے ہی شہزادی انگنائی میں پہنچی تو کیا دیکھتی ہے شہ نشین میں سے ایک لڑکی ننگی چم مادر زاد منھ پھاڑے اس کی طرف دوڑی اور للکار کر کہا۔آ میں تجھے کھاوں۔ شہزادی نے جلدی سے نیفے میں سے ایک پڑیا نکال کھول اس کے منھ میں ڈال دی۔وہ ایک ہولناک چیخ مار پیچھے ہٹی۔شہزادی اس کی چیخ سے سر سے پاوں تک بیری کی طرح تھر تھر کانپنے لگی۔اور وزیر

زادی منھ پھاڑ پھراس کی طرف لپکی اور دانت پیس کر کہا آ میں تجھے کھاؤں۔ اس نے دوسری پڑیا بھی اس کے منھ میں پھینک دی۔ وزیرزادی کولرزا چڑھ گیا۔ ایک رنگ آتا تھا اور ایک رنگ جاتا تھا۔ شہزادی بھی کانپ رہی تھی کہ وزیرزادی نے تیسرا حملہ منھ پھاڑ کر کیا۔ اور شہزادی نے تیسری پڑیا اس کے حلق میں جلدی سے چھوڑ دی۔

وزیرزادی نے جب اپنے ستر کو دیکھا شرما کر ایک حجرے میں بھاگی اور آوازیں دینے لگی کہ ارے ہاں رے کوئی ہے جلدی سے میرا لباس لاو۔ پہرے چوکی والے جو سن گن لینے کو ادھر ادھر لگے ہوئے تھے۔ وزیر کی محل سرائے کی طرف دوڑے وزیر اور وزیربیگم سنتے ہی ننگے پاوں ننگے سر خوشی کے مارے گھبرائے ہوئے آئے۔ اتنے میں توشے خانے والیاں پوشاک لے پہنچ گئیں۔ حمامنوں نے حمام کراہ پوشاک پہنادی۔ وزیر اور وزیربیگم نے وزیر زادی کو گلے سے لگایا۔ آنکھیں اور ماتھا چوما اور دونفل شکرانے کے پڑھ شہزادی سے کہا کہ آج سے ہم نے تمھیں آزاد کیا۔ ہماری ایک اکلوتی بیٹی تھی۔ وہ تمھاری وجہ سے انسان کی جون میں آئی اب دوسری بیٹی تم ہو پہلے تم بعد میں یہ گھر بار مال متاع سب تمھارا ہے۔ جو چاہو لو جس کو چاہو دو شہزادی نے عاجزی سے کہا کہ اس بندی کو جانے دو۔ اور مجبور کر سب کو روتا چھوڑ گھر سے نکل شہر کے باہر ہوئی اور چلنے لگی۔

پھر وہی سو سوا سو برس کے بڈھے آئے۔ پھر شہزادی نے کہا کہ اس بندی کو لے چل کر بیچو۔ بڈھوں نے پھر گھگیا کر کہا کہ ائے شہزادی کیا ظلم کرتی ہے۔ ہمارا شہزادہ سنے گا تو ہمارا زن بچہ کو لہو پلوا دے گا۔ آخر مجبور ہو لے کر چلے چلتے چلا رستے کی کھکھڑیں اٹھاتے۔ گرتے پڑتے ایک شہر میں پہنچے۔ نخاس میں لے جا، شہزادی کو بیچ ڈالا شاہی خواص آئے اور لے جا کر محل میں چھوڑ دیا وہاں شہزادی کو ٹاٹ کی کرتی اور وار ٹاٹ کا جانگیہ، ٹاک کی چونا ٹوپی پہنا ہاتھ میں بانس دے حکم دیا کہ سارے دن کوئے ہنکایا کرے۔ دیکھو کرموں کے پھیر شہزادی سے کوئی ہنکنی بنی۔ جنھیں لاڈ گھنیرے انھیں دکھ بہتیرے۔ کٹو بانس کٹو بانس کرتی کوٹھے ماڑی ماڑی بھاگتی پھرتی۔ جھوٹن جھاٹن کھا رات کو پڑ رہتی۔ لیکن نیند کہاں پرے پڑے تارے گنا کرتی۔ اسی طرح پڑتی تھی کہ آدھی نوبت جھڑی آدمی رات ادھر، آدھی رات ادھر سووے سنسار جاگے پاک پروردگار۔ دیکھتی کیا ہے کہ ایک بڑھیا منھ کالا، ٹوٹا ٹھڈا جھکی کمان کبھ نکلا۔ گناہوں کے بوجھ سے دوہری ہوئی جاتی۔ شوق اور ہوس کا یہ عالم کہ زمین پر کے گناہ ٹٹولتی تھی۔ کبڑی کا ہسکو تھی۔ چوٹوں کی طرح دبے دبے پاوں چلی۔ شہزادی کو اچنبھا ہوا کہ بڑھیا اتنی رات کو کہاں چلی۔ یہ بھی دبے دبے قدموں اس کے پیچھے ہوئی۔ بڑھیا نے ادھر دیکھا ادھر دیکھا۔ پھر ایک کنجی اپنے کمر بند سے کھولی اور ایک کوٹھڑی کا قفل کھولا۔ اس طرح ایک کے اندر ایک سات کوٹھڑیا تھیں۔ ان سب کے قفل کھول ایک زینے سے تہہ خانے میں اتری۔ وہاں اندھیرا گھپ بڑھیا نے ایک ننھا سا دیا جلایا۔ اس کی مدھم روشنی میں ایک پندرہ سولہ برس کا لڑکا۔ ہڈی سے چمڑا لگا نظر پڑا۔ بڈھیا نے اس لڑکے کو دیکھ کر کہا کہ شہزادے اس بندی سے نکاح کرے گا۔ شہزادے نے نہایت کمزور آواز میں جواب دیا کہ اے دوا تو میری دوا میرے باپ کی دوا میں تجھ سے کیسے بیاہ کر لوں۔ بڑھیا کو یہ جواب سن کر بڑا غصہ آیا۔ اور اپنے ہاتھ کے عصے سے مارنا شروع کیا۔ شہزادے میں پہلے ہی کونسا دم تھا۔ بیہوش ہو گیا ایک بدھنی میں سے پانی لے کر چلوؤں سے اس کے منھ پر چھینٹے دیئے اور پھر وہی سوال کیا۔ شہزادے نے پھر کراہتے ہوئے جواب دیا کہ اے دوا تو میری دوا میرے باپ کی دوا میں تجھ سے کس طرح بیاہ کر لوں۔ بڑھیا نے پھر چڑ کر مارنا شروع کیا۔ شہزادہ بیہوش ہو گیا

پھر ہوش میں لائی۔ اور پھر وہی سوال کیا۔ شہزادے نے وہی جواب دیا کہ اے دوا تو میری دوا میرے باپ کی دوا میں تجھ سے کس طرح بیاہ کرلوں۔ اس پیاروں پیٹی نے پھر جھلا کر اس کو برا بھلا کہنا شروع کیا۔ جب دو گھڑی رات باقی رہی۔ ایک مٹی کے انجورے میں تھوڑا سا پانی اور ایک سوکھا ٹکڑا روٹی کا اس کے آگے ڈال کر تالے لگاتی باہر نکل آئی۔ اور اپنے ٹھکانے پر چلی گئی۔ شہزادی بھی اس طرح آن اپنی جگہ پر پڑی رہی کہ بڑھیا کے فرشتوں کو بھی اس کا علم نہ ہوا۔

دوسرے دن جب رات ہوئی۔ اور محل کی دوسری لونڈیاں سونے چلیں۔ تو شہزادی نے چپکے سے کہا کہ بہنو آج اگر جاگو تو تم کو ایک تماشہ ایسا دکھاوں کہ تم حیران رہ جاو۔ سب پوچھنے لگیں تو شہزادی نے کہا کہ چپ چاپ سونے کا بہانہ کر کے لیٹی رہو، جب میں اشارہ کروں تو اٹھنا۔ سب اسی طرح بن کر پڑ رہیں۔ جب آدھی رات ہوئی وہی بڑھیا پھر آئی۔ ساتوں تالے کوٹھڑیوں کے کھول تہہ خانے میں اتری ایک ننھی سی دیولی جلائی اور شہزادے سے وہی سوال کیا۔ شہزادے نے پھر وہی جواب دیا کہ اے دوا تو میری دوا میرے باپ کی دوا میں تجھ سے کیسے بیاہ کرلوں۔ جیسے ہی بڑھیا نے اٹھایا عصا مارنے کو سب کی جنیاں دھم دھم کرتی اس پر جا پڑیں اور اس کے جھونٹے گھسیٹتی باہر لائیں۔ بادشاہ سلامت اور ملکہ زمانی کی خبر ہوئی، شہزادے کو ہاتھو ہاتھ باہر لائے۔ روئی کے پہلوں میں دبکایا۔ منہ میں دودھ ٹپکا سر پر بالوں کا جھنڈ ولا ہو گیا تھا۔ ہاتھ پاؤں کے ناخون بڑھ گئے تھے۔ رنگ زرد ہلدی کی گرہ ہو گیا۔ سانس ایسا آہستہ آتا تھا کہ خیال کرنے سے چلتا معلوم ہوتا۔ غرض شہزادے کو حمام کرایا۔ بال اور ناخن ترشوائے اور لباس پہنایا۔

اس بڑھیا کو لونڈیوں باندیوں نے گڑھا کھود کر آدھا دفن کیا اور آدھا باہر رکھ اور تھوکر تیروں اڑوا دیا۔ شہزادی کو بادشاہ سلامت کے سامنے پیش کیا۔ بادشاہ سلامت نے شہزادی کو گلے لگایا اور فرمایا کہ ہمارے کوئی بیٹی نہ تھی اللہ نے تم کو بھیجا ہے۔ تم میرے ہی دین کی بیٹی میں تمہارے دین کا باپ۔ یہ تمھارا بھائی ہے جب یہ بڑی منتوں مرادوں کے بعد پیدا ہوا تو اسی رات کو غائب ہو گیا۔ سولہ برس کے بعد پہہ آج ملا ہے۔ وہی مرد و دداچرالی تھی۔ تمھارے طفیل سے ملا ہے۔ آدھی سلطنت تمھاری اور آدھی اس کی۔ آناًفاناً میں یہ خبر ساری سلطنت میں پھیل گئی۔ گھر گھر شادیاں ہونے لگیں۔ نقارے بجنے لگے۔ شہزادی نے ادب سے ہاتھ باندھ عرض کی کہ اس بندی کو آزاد کر دیا جائے۔ بادشاہ نے کہا کہ بیٹی تم اپنے باپ کو شرمندہ کرتی ہو۔ تم آزاد ہو اور ہم دونوں تمھارے لونڈی غلام ہیں۔ اب یہ لفظ زبان پر لا کر ہمیں محجوب نہ کرنا۔ لیکن شہزادی نے ایک نہ مانی اور سب کو روتا چھوڑ نکلی شہر سے باہر ہوئی۔

چلتے چلتے رات ہو گئی۔ ایک درخت کے نیچے پڑ رہی کہ ایک جوڑا گڑ پنکھ گڑ پنکھنی کا آیا۔ گڑ پنکھنی نے کہا کہ پنکھ کچھ کہہ اس نے کہا کیا آپ بیتی کہوں کہ جگ بیتی۔ گڑ پنکھی نے کہا کہ جگ بیتی سے کیا آپ بیتی کہہ گڑ پنکھ نے کہا کہ گڑ پنکھی ہمارے شہزادے کو کسی کم بخت نے ایسا جلایا ہے کہ نہ اس کو دن چین ہے نہ رات۔ ایک چیخ زمین ہے تو ایک چیخ آسمان۔ اگر کوئی اس کا دوست دار ہو اور ہماری یہ بیٹ سمیٹ کر لے جائے۔ اور کوری کونڈی میں حل کر کے پٹیوں پر لگا اس کے زخموں پر باندھے تو وہ فوراً اچھا ہو جائے شہزادی یہ سب سنتی رہی۔ صبح ہوئی تو ساری بیٹ سمیٹ کر ڈوپٹے میں باندھ لی۔ پھر وہی سوسوا سو برس کے بڈھے ملے شہزادی نے ان سے کہا کہ مجھے ایک وید کا لباس لا دو اور اپنے شہزادے کے شہر تک پہنچا دو۔ بڈھوں نے وید کا لباس لا دیا۔ شہزادی نے وید کا بھیس بدلا۔ کناری کی پگڑی اور کالی کنی کی دھوتی باندھی۔ گول پیڑ کا اونچی چولی کا انگوچھا۔ چٹکی کے چنے دامن سیدھے ہاتھ کی طرف بند

لال نری چولی، صندل کا قشقہ، کندھے پہ ڈال وید حکیم وید حکیم کہتی شہر میں وارد ہوئی لوگوں نے دیکھا نیا وید آیا ہے۔ کسی نے کہا ہلاو کسی نے کہا کہ سینکڑوں آئے علاج کیا اور چلے گئے۔ کوئی فائدہ نہ ہوا۔ آخر کو اسے بلا ہی لیا۔ شہزادی نے کہا کہ ایک لوٹا اور کوری کونڈی لاو۔ ٹھنڈے پانی میں بیٹ ڈال کونڈی میں حل کی اور پٹیوں پر انضماد کر زخموں پر چڑھا دیں۔ پٹیوں کا زخموں پر بندھنا تھا کہ شہزادہ کی ایک چیخ آسمان تھی اور ایک چیخ زمین۔ ٹھنڈک پڑی۔ پٹ سے آنکھ بند ہوگئی۔ باہر لوگوں نے جو دیکھا کہ اب آواز بھی نہیں آتی۔ بیتاب ہو گئے کہ کم بخت وید نے کیا کر دیا۔ کچھ بھی تھا لیکن ہمارا شہزادہ زندہ تو تھا۔ اس نے معلوم نہیں کیا کر دیا۔ تلواریں سونت کر وید کو قتل کرنے اندر گھسے۔ گڑ بڑ سے شہزادے کی آنکھ کھل گئی۔ ہاتھ اٹھا نہ سکا۔ آنکھ کے اشارے سے سب کو منع کیا۔ سب کی جان میں جان آئی۔ شہزادی نے دمبدم پٹیاں بدلنی شروع کیں۔ سارے گھاو بھر آئے اور تیسرے دن شہزادہ بالک بھلا چنگا ہو گیا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ تھا۔ غسل صحت کر دربار عام کیا۔ اور وید کو بلا کر کہا کہ مانگ کیا مانگتا ہے۔ شہزادی نے تین قول لیے کہ جو مانگوں سو پاؤں۔ شہزادے نے تین قول جب دے دیئے۔ تو شہزادی نے کہا کہ پیپ راو کی پٹیاں شہزادے کے ہاتھ کی مندری اور کمر کی کٹار۔ شہزادے نے کہا کہ ارے کچھ نہ مانگا۔ اگر میری سلطنت مانگتا تو تجھ کو دیتا۔ وہ تینوں چیزیں تو شہزادے نے دے دیں۔ ان کے علاوہ اس کو سات دفعہ سونے روپے اور جواہرات میں تلوایا۔ امیر امراؤں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق وید کو دیا۔

شہزادی نے وہ سب مال لٹا دیا۔ اور سوا سو برس کے بڈھوں سے کہا کہ جلدی مجھے اسی بارہ دری میں پہنچا دو۔ بڈھوں نے شہزادی سے کہا کہ ذرا آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیں۔ جوں ہی شہزادی نے آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ زمین کی لمبائی کھچ گئی۔ اب وآنکھ کھول کر دیکھتی ہے۔ تو وہی بارہ دری ہے۔ اور اسی طرح کی رونق اور بہار۔ دوا نے سرے پاؤں تک بلائیں لیں صدقے قربان ہوئی۔ جب رات ہوئی شہزادی نے اچھپر کھٹ کے پاس سونٹا اور کنڈالی اور پیپ راو کی پٹیاں رکھیں تکیے کے پاس کٹار رکھی اور اپنی انگلی میں شہزادے کی مندری پہن ماتھے پر ہاتھ رکھ سکھ سیج پر سو گئی۔ جب شہزادہ آیا۔ اپنی انگوٹھی، کٹار اور وہ پٹیاں دیکھ حیران رہ گیا۔ اور فوراً شہزادی کے پاؤں میں گر پڑا شہزادی نے جلدی سے اٹھ کر شہزادے کا سر اٹھایا دونوں مل کر خوب روئے۔ جب دل کی بھڑاس نکل گئی اور جی ہلکے ہوئے تو شہزار کو ماں باپ کی یاد آئی۔ شہزادے نے شہزادی کو بڑے تزک احتشام اور لاڈ لشکر کے ساتھ ماں باپ سے ملانے لے چلا ان کو جب خبر ہوئی کہ کوئی بادشاہ بڑی فوج لیے ادھر بڑھتا چلا رہا ہے۔ تو قاصدوں کے ذریعہ پیغام بھجوایا کہ باوا ہم ضعیف غمزدہ ہیں۔ ہم پر یہ کیوں چڑھائی ہے۔ ہم کو اس ملک اور حکومت سے کیا سروکار ہے۔ پلاو کی ایک قاب اگر مل گئی تو ہمارے لیے بہت ہے۔ جب معلوم ہوا کہ شہزادی اور شہزادہ آرہے ہیں۔ مارے خوشی کے مردہ جسموں میں جان آ گئی۔ اور بیٹی داماد سے ملنے کے لیے باہر آئے۔ شہزادہ گھوڑے سے کود کر بادشاہ سے قدم بوس ہوا۔ بادشاہ نے اٹھا کر گلے سے لگایا۔ بیٹی کو چوما آنکھیں جو دونوں کی روتے روتے اندھی ہوگئی تھیں۔ بیٹی داماد کو دیکھ کر روشن ہو گئیں۔ اور سب مل جل کر محبت پیار سے ہنسی خوشی رہنے لگے۔ اور شہزادے نے پھر کبھی کتے کا چولا نہ پہنا۔ اور ہمیشہ آدمی ہی کی جون میں رہا۔ اللہ نے جیسے ان کے دن پھیرے ایسے کہتے سنتوں کے دن پھیرے۔ میں نے یہ کہانی آٹھ نو برس کی عمر میں اپنی دوا حسینی سے سنی تھی۔ ان ہی کے لفظوں میں جوں کا توں لکھنے کی کوشش کی ہے۔

☆☆☆

آغا حیدر حسن مرزا

خاکہ

سرون فریزجن

فریزجن اور سرون کے گیت لکھنے سے پہلے ضروری معلوم ہوا کہ اس زمانے کے تھوڑے سے تاریخی حالات بیان کر دیئے جائیں تا کہ گیت کی کچھ اہمیت بڑھ جائے۔ ولیم فریزر جس کو دلی والے فریزجن کہتے ہیں سنہ 1799ء میں کلکتہ آ کے اُترا اور سنہ 1805ء میں اختر لوئی کا معتمد مقرر ہوا۔ سنہ 1811ء میں الفن کا معتمد ہو کر کابل گیا۔ سنہ 1813ء میں سیٹن کا نائب مقرر ہو کر پھر دلی آیا۔ 1815ء میں مارٹن ڈیل کی فوج میں پولیٹکل ایجنٹ ہو کر ہمالیہ کا سفر کیا۔ 1819ء میں گڑھوال کی حد بندی کے جھگڑے کا تصفیہ کرنے پر تعینات ہوا۔ 1826ء میں شمال مغربی سرحدی صوبے کی مالگزاری کا رکن ثانی بنا دیا گیا۔ 1830ء میں شاہجہاں آباد کا ناظم یا صاحب کلاں ہو کر آیا۔ اور اپنی درافتہ مزاجی کی بدولت 23/مارچ 1835ء میں کسی کے ہاتھوں ٹھکانے لگ کر زمین کا پیوند ہوا۔ کشمیرہ دروازے جیمس کے گرجا میں مدفون ہے۔

شاہ عالم کی وفات کے کچھ عرصہ بعد سے کمپنی کا یہ رویہ ہو گیا تھا کہ جس طرح بھی بنے دلی کے آس پاس کی کل جاگیروں کو ہضم کر جائے۔ میرے دادا حضرت ہز ہائنس عالی جاہ پرنس آغا حسین جان نائٹ آف دی ارڈر آف پرشین لا اینڈ نائٹ آف دی آرڈر آف رائل ایمپائز ر انگریز نوازی کی بدولت سارے شہر میں بدنام تھے اور لوگ انھیں کرستان کہا کرتے تھے۔ ان کی سترہ حرمیں تھیں۔ جن میں چار مختلف ممالک کی فرنگنیں بھی تھیں۔ اپنی دو بیٹیوں کو انگلستان تعلیم کے لیے بھجوا چکے تھے۔ یہ دلی کے ان آدمیوں میں سے ہیں جنھوں نے سب سے اول انگریزی پڑھی اور انگریزی میں کتابیں لکھیں۔ 1831ء سے روزنامچہ لکھنا شروع کیا اور 1878ء تک مسلسل لکھتے رہے۔ یہ تمام قلمی مسودے سوائے تین چار جلدوں کے میرے قبضہ میں تھے۔ افسوس ہے کہ 1922ء میں جب کہ میرا انھیں طبع کرانے کا ارادہ تھا چوری چلے گئے۔ اب اس کی بعض بعض جلدیں میرے خاندان کے مختلف افراد کے قبضہ میں ہیں۔ اس روزنامچہ سے اس زمانہ کی فرنگیوں اور خاص کر انگریزوں کی ایشیائی پالیسی اور ان کی خفیہ ریشہ دوانیوں، رشوت ستانیوں، جوڑ توڑ کرنے میں مال و دولت، عزت ناموس کو قربان کر دینے کی کارگزاریوں پر حیرت انگیز روشنی پڑتی ہے۔ میرے دادا حضرت انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹ بھی کچھ دنوں رہے ہیں۔ ان کے دادا کی ایک بہت بڑی جاگیر تھی جس کی آمدنی بیس لاکھ روپے سال تھی اس میں فیروز پور، محصر کر پلول اور ہوڈل وغیرہ علاقہ جات شامل تھے لیکن مرہٹہ گردی میں یہ تمام جاگیر جو شاہان مغلیہ کا عطیہ تھی جاتی رہی اور مرہٹوں نے اس کو دوسرے لوگوں کے حوالے کر کے چھوٹی چھوٹی مختلف زمینداریاں قایم کر دیں۔ لارڈ ولیم پینٹنگ نے ایک رسالے میں اس جاگیر کا حال درج کیا ہے جو کلکتہ میں چھپا تھا۔ اور بلو بک لندن میں یہ واقعہ مسطور ہے۔ میرے دادا حضرت کے دادا نے چاہا کہ اس جاگیر کو واپس لیا جائے اس لیے انہوں نے کمپنی سے دوستی پیدا کی۔ کمپنی نے جاگیر کی واپسی کی امید دلائی لیکن شرط یہ قرار پائی کہ شاہ عالم مرہٹوں سے علیحدگی اختیار کریں اور کمپنی کی سرپرستی قبول فرمائیں۔ انگریزوں کا رسوخ دلی میں ہو جائے اور سب فرنگی کتوں سے کٹ جائیں۔ یہ اس زمانہ میں

شاہ عالم کے وزیر تھے۔اور حضرت عالمگیر ثانی کے بھانجی موتی بیگم ان سے منسوب تھیں۔موتی بیگم کو شاہ عالم کے مزاج میں بڑا دخل تھا۔اور شاہ عالم ان کے مشورہ کو بہت سنتے تھے۔آخر شاہ عالم کو مرہٹوں سے تڑالائے جب لیک نے دلی فتح کی اور ایفائے وعدہ کا وقت آیا تو ان کو کچھ نہ ملا بلکہ اس جاگیر میں سے مختلف جاگیریں نئی بنا دی گئیں جن میں سے لوہارو پاٹوڈی دوجانہ فرح نگر وادی وغیرہ مشور ہیں لیکن یہ نئی جاگیریں مصلحت وقت کے لحاظ سے بنائی گئی تھیں۔کچھ عرصہ بعد کمپنی کا طرز عمل بدلا تو یہ بے ضرورت معلوم ہونے لگیں۔دوسرے دہلی کے نواح میں جو مسلمانوں کی سات سات آٹھ آٹھ سو برس کی پرانی جاگیریں تھیں اور جہاں مسلمان صدیوں سے قابض تھے ان کے زور کو توڑنا اور ان کا سر کچلنا بھی مقصود تھا۔اس نواح کے ہندو جاگیردار بھی مغل پرستی اور اسلام دوستی میں مسلمانوں سے کسی طرح کم نہیں تھے بلکہ کچھ ان سے بھی زیادہ تھے۔تاہم ایک امید کی جھلک ضرور ان کی بدولت نظر آتی تھی کہ مناسب موقع پر بیچ میں ہڈی ڈال کر شکاری کتے لڑا دیئے جائیں۔نفاق کے گودے پر یہ ہندو مسلم گلام اور اچھی پالی کی بہادر دکھا جائیں گے۔اس لیے ہندوؤں کو ہاتھ نہ لگایا گیا۔ان کی چھیڑ کو وقت پر اٹھا رکھا۔کمپنی کا یہ وطیرہ ہو گیا کہ ہر حیلے ہر بہانے چھوٹی موٹی زمینداروں اور جاگیروں کو ضبط کرنے لگی۔اس سے ایک عام بد دلی اور اضطراب پیدا ہو گیا۔1857ء میں شہر والوں کو انگریزی فوج کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے دفع کرنے کے لیے کھڑے ہونے کا ایک باعث یہ تھا۔1842ء میں چھوٹی بڑی بہت سی جاگیریں ضبط ہوئیں ان میں سے منجھلی بیگم اور چھوٹی بیگم نواب صیام الدولہ کی سالیوں کی جاگیر مجاہد پور حوض خاص میر احمد علی خان کی جاگیر اوکھلہ وغیرہ۔نواب حافظ عبدالرحمٰن خان احسان استاد شاہ عالم و وزیر حضرت بہادر شاہ دیگر مسلمانوں کی جاگیریں زبردستی بے سبب لے لی گئیں۔مرہٹہ گودی میں عارف خان کے بیٹے احمد بخش خان نے اچھا نام پیدا کیا۔اور جب لیک کی مرہٹوں سے لڑائی ہوئی تو انہوں نے لیک کا ساتھ دیا۔فتح کے بعد فیروز پور کا بڑا علاقہ ان کو دے دیا گیا۔اور حضرت بادشاہ سلامت سے نواب کا خطاب بھی مل گیا۔ان کی دو بیویاں تھیں نکاحتا سے نواب شمس الدین تھے اور بیاہتا سے نواب امین الدین و نواب ضیاء الدین تھے لیکن یہ دونوں عمر میں چھوٹے تھے۔اس لیے نواب احمد بخش خان نے اپنی زندگی میں ہی ساری ریاست کا کار مختار اپنے بڑے بیٹے نواب شمس الدین خان کو کر دیا اور دونوں چھوٹے بھائیوں کی اچھی طرح غور پر داخت تعلیم و تربیت کر دی۔جب تک نواب احمد بخش خان زندہ رہے نواب شمس الدین ریاست کا کام سنبھالے رہے اور اغیار کو کوئی موقعہ جوڑ توڑ کا نہ ملا۔ادھر تو ان کی آنکھیں بند ہو گئیں اودھر دراندازیوں نے نت نئے شاخسانے نکالنے شروع کیے اور اس کی کوشش کی کہ بھائیوں بھائیوں میں چلوا دیں۔کبھی چھوٹے بھائیوں کی نا بالغی درمیان لگا کے نواب کو دبایا جاتا۔کبھی حصے بخرے ریاست کے کرائے جاتے۔دلی کی نظامت سے کچھ فیصلہ ہوتا۔کلکتہ کی کونسل سے کچھ قرار پاتا۔لندن کی چپار چودھرس کچھ اور تصفیہ کرتی۔غرض دلی کے صاحب کلاں کے گہرے تھے۔لاکھوں روپیہ اس ہیر پھیر میں وصول کیا جو نیا صاحب کلاں ہو کے آیا اس نے نیا رنگ جمایا اور خوب خوب نقدیاں اڑائیں۔مقصود یہ تھا کہ کسی طرح اس ریاست کا تیا پانچہ ہو جائے۔اس سے فراغت ہو تو دوسری ریاستوں پر ہستہ مارا جائے۔آخر کمپنی نے سرپنچ ہو کر لوہارو کے

علاقہ کو جو مہاراجہ الور نے نواب فخر الملک احمد بخش کو ان کی خدمات کے صلہ میں دیا تھا لینا چاہا۔ اور امین الدین خاں اور ضیاء الدین خان کے دلوں میں طرح طرح کے وسوسے ڈلوائے کہ کسی طرح یہ از خود علاقہ کمپنی کے سپرد کر دیں۔ لیکن انہوں نے اس کو منظور نہ کیا اور لوہارو کا علاقہ نواب شمس الدین ہی کے قبضہ میں رہا۔ وہ معقول گزارہ اپنے دونوں چھوٹے بھائیوں کو دیتے رہے۔ جواہرات اوت کتب خانہ بھی ان ہی بھائیوں کے قبضہ میں رہا۔ کتب خانہ آخر میں نواب ضیاء الدین نے اپنی مطلب بڑھالے کر ایلیٹ کی نذر کیا۔ اس نے ان کا کام نکالا اور تاریخ ہندوستان کی ترتیب میں اس کو اسی کتب خانہ سے بڑی مدد ملی۔ نواب شمس الدین نے دلی کے صاحب کلاں سے ہمیشہ میل جول رکھا۔ اس کو بلا ناباز دید کے لیے اس کی کوٹھی پر جانا، دعوت جلسے سب ہی میں اس کو شریک کیا۔ کبھی کسی قسم کی شکایت کی اس کو گنجائش نہ دی اور فریزر سے تو خوب گہری دوستی اور بڑی پرانی تھی۔ فریزر اول اول جب دلی میں آیا تو اس کا سن اٹھارہ برس کا تھا۔ نواب کا بھی عنفوان شباب تھا۔ نواب احمد بخش خان زندہ تھا۔ نواب شمس الدین کو کسی قسم کو فکر نہ تھی نہ ذمہ داری انگریز اہلکاروں سے ملنا جلنا راگ رنگ میں شریک ہونا اس زمانہ کے نئے امیر زادوں کی وضعداری تھی لیکن شہر کے قدیم امراء اس کو بہت معیوب خیال کرتے تھے جب فریزر دلی کا ناظم ہو کر آیا تو اس زمانہ میں ریاست کی ذمہ داری نواب کے سر تھی۔ اور بری بھلی چیز میں تمیز آسانی سے کر سکتے تھے انہوں نے قدیم صحبتوں سے اجتناب کیا۔ فریزر کو یہ چیز بے انتہائی شاق گزرتی تھی۔ کوئی کھلم کھلا کم لگانے کا موقع دستیاب نہ ہوتا تھا خوئے بدرا بہانہ بسیار، بی بکری ناو میں کیوں خاک اڑاتی ہو۔ اس کو کوئی کیا کرے۔ نواب شمس الدین خان جو پہلے ہزار اچھوں کے ایک اچھے تھے اب لاکھ بروں کے ایک برے ہو گئے۔ بات بات میں نکتہ چینیاں ہونے لگیں۔ بد انتظامی تو یہ تھی کہ بستی تو تھی محض میواتیوں کی پر کبھی چوری ہوتی تھی نہ چکاری نہ کس کا خون ہوا نہ خرابا نہ غریبوں کی بہو بیٹیاں زبردستی پکڑا منگواتے تھے۔ کمپنی نے آخر کو کھوج نکالا کہ یہ چوروں اور ڈاکوؤں سے ملے ہوئے تھے۔ اس لیے ان کے علاقہ میں تو چوری ڈکیتی ہوتی نہ تھی اور لوگ خوش حال تھے۔ البتہ کمپنی کے علاقوں میں سنگین وارداتوں کی کمی نہ تھی اور کیوں نہ ہوتی ''چوٹی کتیا جلیبیوں کی رکھوالی'' ہاں نواب کے حق میں بھی وہی خرابیاں ہوتی تو گلہ نہ تھا۔ ایک حمام میں سب ننگے ہوتے۔ نکٹوں میں ناک والوں کی کمپنی کے دل میں نواب کی گنجائش نہ رہی اور ریاست کی بحالی کانٹے کی طرح کھٹکنے لگی کہ جانے یہ بی گلابی کس دن رنگ لائیں اس لیے اس اٹھتے پودے کو جڑ سے چٹک لینا چاہیے۔ فریزر شروع جوانی میں ایک جاٹنی کو جس کا نام سرون تھا زبردستی اس کے گاؤں کو جا کر پکڑ لایا تھا۔ اس جاٹنی کی قلمی تصویر خواجہ محمود صاحب کے پاس تھی جو انھوں نے لال قلعہ کے عجائب خانہ کو دے دی۔ یہیں ایک تصویر نواب شمس الدین کے لڑکپن کی بھی ہے۔ زیادہ سے زیادہ اس میں اٹھارہ برس کا سن معلوم ہوتا ہے۔ فریزر کی عمر اصلیت سے زیادہ معلوم ہوتی ہے اور چہرے سے اس کے آوارگی اور بدمعاشی برستی ہے۔ گالوں میں گڑھے پڑے ہوئے آنکھوں میں حلقے ہونقی چہرہ تھوڑی پر چھدری داڑھی دے دوں کے برے طور خمیدہ تختی بد اطواری کی علامات نمایاں کرتی۔ غرض انجانتا تصویر دیکھ یہ کہہ دے کہ یہ کسی برے بدطینت بدخصلت آوارہ منش کی شبہ ہے۔ فریزر کو دیسی عورتیں بہت پسند تھیں۔ سرون سے پہلے کسی لوہارنی کو گھر میں ڈال

لیا تھا اور اس کے بعد ایک سنہارنی کو پکڑ لایا۔ پر لے سرے کا ایک چھٹا ہوا تھا۔ میری دادی حضرت کے پاس کی بڑھی بوڑھی مغلانیاں محمدی خانم، شرف النساء وغیرہ کہا کرتی تھیں کہ نواب احمد بخش خان کی صاحبزادی حسن آراء بیگم یا حورلقا بیگم کے حسن کا شہرہ سن کر زنانے کپڑے پہن ڈومنیوں کے ساتھ حویلی میں گھس گیا کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوئی۔ صاحب زادی جب طشت چوکی پر گئیں تو آنکھ بچا کر صحت خانہ میں گھس گیا وہ ایک اجنبی صورت دیکھ کر ڈر گئیں چیخ جو ماری پہرے والیاں دوڑ کر اندر گئیں۔ دیکھا ایک لمبی تڑنگی عورت سرانچے کا بانس سر سے پیر تک چادر میں لپٹی کھڑی ہے سب کی سب مل کر گھسیٹتی ہوئی باہر لائیں۔ خوجوں کو بلوایا دکھوایا تو موا مرد وانکلا۔ خوب جوتی کاری ہوئی۔ نواب احمد خان جان مر چکے تھے۔ نواب شمس الدین خان ان کے بڑے بیٹے گدی کے مالک تھے۔ ان کا حسن اور طنطنہ شہر میں مشہور تھا۔ سب نے کہا بستم بستم۔ نواب کے کان اس کی بھنک نہ پڑنے پائے ورنہ خون خرابے ہو جائیں گے۔ نگوڑے کی چندیا تو پلپلی کر دی۔ موا غیرت دار ہوتا تو چمپنی بھر پانی میں خود ہی ڈوب مرے گا۔ باہر مردوں تک یہ بات کیوں جائے۔ غرض قصہ رفع دفع ہوا نواب شمس الدین کی میں نے ایک اور تصویر دیکھی ہے جوان کی پختہ عمری کی ہے۔ لٹ پٹی پگڑی بانکی ادا سے بندھی انگرکھا پہنے سیلا کمرے سے باندھا خنجر اس میں اڑ سا داڑھی چڑھی صورت سے بہادری و مردانگی ہویدا۔ اس تصویر سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص اب تائب ہے اور لڑکپن کی تمام کمزوریوں کو دور کر چکا ہے۔ فریزر سے آخر کے دنوں میں بس دور ہی کی صاحب سلامت رہ گئی تھی۔ نواب جلسوں سے بھاگتا تھا اور عیاشیوں سے کانوں پر ہاتھ دھرتا تھا۔ فریزر کو یہ باتیں ناگوار گزرتی تھیں اور اکثر وہ اس کا گلہ اپنے دوستوں سے برملا کیا کرتا۔ میرے دادا حضرت سے بھی دوستی تھی اور اس کے بہت سے خطوط میرے والد صاحب کے قبضہ میں تھے جو نقائص اپنے میں تھے وہی اس کو نواب میں نظر آتے تھے۔ بلکہ کچھ اس سے بھی زیادہ فریزر سے سینکڑوں لوگ نالاں تھے جن کی بہو بیٹیاں اڑائی تھیں وہ اس کے خون کے پیاسے تھے اور آئے دن کے جو نئے جھگڑے ادھر ادھر رنڈیوں اور کسبیوں کے کوٹھوں اور اڈوں پر سے خرید لایا تھا وہ الگ رہے۔ شہر کے بیسیوں اوباشوں، رنڈی بازوں، بدمعاشوں سے اس کی لاگ ڈانٹ تھی۔ شریف اور امراء ملنے میں عار سمجھتے۔ مگر مطلب سے مجبور اور غرض سے دو چار تھے۔ بن ملے نہ بنتی تھی۔ فریزر رات بے رات وقت بے وقت اڈوں، کوٹھوں کنچریوں میں خراب خستہ پڑا پھرتا تھا۔ اور آخر اسی شہدے پن اور آوارہ گری میں جان گنوائی۔ راجہ کشن گڑھ کے پاس ناچ گانے کا جلسہ تھا خوب پی اور بدمست ہوا۔ آدھی رات کو گھر کی سوجھی کوتیوں میں کسی نے بھر دو گاڑ جھونک دیا یہ تو اپنی جان سے گیا اور اپنے کیے کی سزا پائی۔ کمپنی کے دونوں بیٹھے ہوئے چت بھی میری پٹ بھی میری انٹا باوا دادا کا طرح طرح کے شہرے ہوئے کبھی ظل سبحانی حضور اکبر شاہ ثانی کی طرف خیال کی جسارت کی۔ کبھی جھجر کے مرزبان نواب فیض طلب خان کو پھانسنے کی سوجھی آخر میں نواب شمس الدین خان تر تراتا نوالہ نظر آئے۔ بس اب کیا تھا ان کے ہاں کچھ خاندانی پیچیدگیاں اور نزاعات ایسے پیدا ہو گئے تھے نواب کی بدقسمتی کہ کریم خان ان دنوں کتے لینے شہر کو آیا ہوا تھا۔ ریاست کے اکثر آدمی آتے جاتے ہی رہتے تھے۔ بلکہ ان سب کے تقریباً مکان شہر اور ریاست دونوں جگہ تھے۔ کبھی یہاں رہتے کبھی باہر ریاست میں کمپنی کے تو ریاست

پردانت تھے کریم خان کے قیام کو دوسری نظر سے دیکھا یہ نواب احمد بخش جان کے زمانے کا تھا اور نشانے میں اپنی ہم سر نہ رکھتا تھا۔ کہتے ہیں اندھیرے میں آواز پر گولی چٹختا تو دانت توڑ گدی کے پار ہو جاتی۔ اس لیے اس کو بھر مار کہتے تھے۔ یہ نواب کا مصائب بھی تھا۔ اس کا ایک خط پکڑا گیا جس میں مذکور تھا کہ اس کے کتے کے لیے گاہک ہیں اگر سب کے مقابلہ میں خریدا تو دام بہت چڑھ جائیں گے۔ نواب نے جواب دیا کہ ایسی کیا جلدی ہے خریدار چھٹیں گے تو دام گر جائیں گے۔ تب لے آنا لیکن لانا ضرور اس پر یہ حاشیہ چڑھایا گیا اور یہ مضمون تراشا گیا کہ کتے کا مطلب کافر فرنگی ہے اس سے مراد فریزر ہے اور یہ اشارہ تھا کہ اس کے ساتھ بہت آدمی رہتے ہیں مارنے میں وقت ہوگی۔ جب چھپا ہوا اورا کا دکا نوکر اس کے ساتھ ہو تو مار لینا۔ بس اب کیا تھا مدعا ہاتھ آ گیا۔ نواب نے کچھ شورہ پشت نادہند میواتی اپنے علاقہ سے نکال دیئے تھے یا وہ میواتی جن کے ذمے ریاست کا لگان تھا وہ چوری چھپے ریاست سے نکل بھاگے تھے اور کمپنی کی سرحد میں جہاں جہاں میواتیوں کی بستیاں تھیں چھپتے پھرتے تھے ان میں سے دو چار کو سکھا پڑھا کر ہموار کر لینا کیا دشوار تھا۔ جو اس ڈھب کے تھے ان کو نواب کے خلاف لا کھڑا کیا اور فریزر کا خون نواب کے سر تھوپ دیا۔ نواب کی طلبی ہوئی ان کارروائیوں کی خبر نواب کو بھی ہوئی آنے سے انکار کیا۔ سارے میواتی لٹھ لے کر کھڑے ہو گئے۔ جو لینے گئے تھے اپلا سا منہ لے خالی آئے۔ آخر بڑی قسما قسمیوں اور حلف درمیان دینے کے بعد نواب دلی آئے۔ اس کفر کچہری میں غریب کا فیصلہ ہوا۔ پھانسی کی سزا تجویز ہوئی۔ سنتے ہیں کان گنہگار ہیں کہ غالب کو بھی ان سے علی کافر کا سا بیر تھا انھوں نے بھی اس کے خلاف گواہی دی۔ دروغ برگردن راوی نواب کے خسر نے بھی پھنسوانے میں مدد دی اور وہی ریاست سے جا کر ان کو شہر میں لائے۔ لیکن یہ روایت نواب امین الدین خان والوں اور ضیاء الدین خان والیوں کی زبانی ہے۔ واللہ اعلم! ہندوستان کے سب سے پہلے مسلمان نواب شمس الدین خان ہیں جن کو پھانسی دی گئی۔ حکم کو انھوں نے بڑے استقلال سے سنا اور کہا کہ خدا عالم ہے کہ میں بے گناہ ہوں اور مجھ پر بیجا ظلم ہو رہا ہے۔ چوں کہ میں مظلوم ہوں اس لیے معصوم اور شہید ہوں۔ شہید مرتے نہیں بلکہ ہمیشہ زندہ رہتے ہیں اس کے بعد کچہری سے باہر آئے اور جو معمول تھے ان میں سر مو فرق نہ آیا۔ اشتہا میں ذرہ برابر کمی نہ ہوئی۔ اچھی طرح اپنے اطمینان سے کھانا کھایا۔ رات ہوئی تو سوئے بھی ایسی بے خبری سے کہ صبح کچھ ہونے والا ہی نہیں۔ لوگوں نے خراٹوں کی آواز سنی۔ صبح غسل سے فارغ ہو وضو کر سبز پوشاک شہیدوں کا بانا پہن مقتل کی طرف روانا ہونا چاہا۔ لیکن ظالم موذیوں نے کپڑے جسم سے اتار لیے اور ٹاٹ کی کرتی اور ٹاٹ کا جھانگیہ ،ٹاٹ کی چونا ٹوپی پہنا کشاں کشاں لے گئے۔ ڈنڈورچی نے پہلے سے ڈھنڈوار پھیر دیا تھا کہ خلق خدا کی ملک بادشاہ سلامت کا حکم، کمپنی بہادر کا جو کوئی عورت مرد بوڑھا بالا مقتل کے قریب آئے گا اور شہر سے باہر نکلے گا مار دیا جائے گا۔ کشمیری دروازے کے باہر انگریزی فوج پھیلا دی گئی اور پیش بینی کے خیال سے آس پاس کے چھاونیوں سے مزید دستے طلب کر کے تعینات کر دیئے۔ تمام رستے روک دیئے گئے۔ بھنگی جو پھانسی کی رسی ڈالتا ہے اس نے جب نواب کو دیکھا رونے لگا اور اپنے بے بسی ہاتھ باندھ کر عرض کی نواب بڑی متانت اور وقار سے آگے بڑھے ذرہ برابر گھبراہٹ یا اضطراب کسی حرکت سے ظاہر نہ ہوتا تھا، جب پھانسی دی گئی تو رسی

ہی پر خود بخود نواب کی لاش قبلہ رخ ہوگئی۔ نواب کی روح جنت کو سدھاری تو کمپنی نے خوشی میں باڑیں سر کیں، شہری باہر نکلے، لاش ٹھنڈی ہوئی تو اتاری سب نے دیکھا کہ منہ قبلے کی طرف تھا۔ جو بہشتی یاور مظلوم ہونے کے باعث نشانی تھی، شہادت کی تمام علامات صاف عیاں تھیں۔ بعد ازاں شہر والوں نے تجہیز و تکفین کی اور قطب صاحب میں دفن کر آئے۔ مدتوں لوگ زیارت کے لیے نواب کی قبر پر جاتے رہے۔ بادشاہ سلامت کو بھی بہت ملال ہوا۔ کچھ عرصے بعد نواب شمس الدین کی حرم معہ نواب کے صاحبزادے نواب مرزا (داغ) لال قلعے میں چلے آئیں اور ان کا مرشد زادہ آفاق مرزا فخرولی عہد بہادر سے عقد ثانی ہوگیا۔ گھر گھر اس شہید مظلوم کا رونا رہا۔ شہر کے وہ قدیم امراء کے گھرانے جو عارف جانیوں کو سمجھتے تھے ان کے شریک غم ہوئے اور جنہوں نے نواب پر توٹتے جوڑے تھے ان پر نفرت کرتے تھے۔ نواب شمس الدین خان کی ریاست ضبطی میں آئی تو میرے دادا حضرت نے اپنی کار گزاریاں اور کمپنی بہادر پر اپنی جانثاریاں گنوائیں اور فیروز پور جھر کے پر اپنا قدیمی استحاق جتایا۔ بہت دوڑ دھوپ کی اس کی پوری کاروائی۔ ''بلو بک'' لندن میں موجود ہے یہ زمانہ جاگیر واپس دینے کا نہ تھا بلکہ جاگیریں اور ریاستیں ہڑپ کرنے کا تھا۔ میرے دادا حضرت کو ان کی تاحین حیات چوبیس ہزار سال گزارے کے ملتے رہے ان کے انتقال کے بعد ان کی چار بیوپاریاں اور چند حرموں کو معقول گزارہ ملتا رہا اور تین لڑکوں کو سو سو روپے ماہوار جیب خرچ ملتے رہے۔ میرے باوا جان قبلہ کی شادی میں سرکار انگریزی سے چھبیس ہزار روپے ملے۔ لیکن کمشنر سے ناموافقت کی وجہ سے گزارا موقوف ہوگیا۔ فیروز پور جھرکہ کے دعوے کا اکثر رہ رہ کے ہمارے خاندان میں مسئلہ اٹھا کیا۔ لیکن گوہر مراد کبھی حاصل نہ ہوا فریزر کی قبر کشمیری دروازے میں جیمس اکسنر کے گرجا میں اب تک موجود ہے۔ دلی کے آس پاس اب بھی جاٹوں کے گاوں میں فریجن کی یاد تازہ ہے۔ دلی پیاری کے بسنے والے خوش نصیبوں میں کون ایسا ہوگا جس نے گلابی جاڑے کی چاندنی راتوں میں قطب صاحب کے قیام یا آس پاس کے جنگلوں میں سیل میں ڈھولک اور سارنگی کے ساتھ لمبی اوپر جانے والی آواز میں کھڑا گ کی کھٹ کھٹ ملے ہوئے سروں میں فریجن اور سرون کا گیت نہ سنا ہوگا۔ گیت سو برس سے زیادہ کا ہے۔ میرے چھٹپن میں بھی شہر میں برسات کی راتوں میں پرانی مائیں اصیلیں، مغلانیاں تھوڑے تھوڑے سے الفاظ کے رد و بدل کے ساتھ گایا کرتی تھیں اور برسات کے گیتوں میں جہاں ''چتر بنجارے'' پتلی سی گھوڑی پائل جارے مغل کے چھوکرے جھجرس پانی کی لا پیاسی میرے چندا روٹی..... جھولا کن ڈولورے امرہان، مہاراجہ، کیوڑیاں کھولورس کے بوندیں پڑیں جمنا پر چھائی رے کالی گھٹا'' آئی اندھیری رات رے میں پہنچی جاوں مان آرو جامن گھلے دھرے'' نیم کی نبولی پکی ساون کا دن آئے گا۔ کوئی بندا چاول لایورے ڈل ہے مسور کی بیر ساون آیا رے اب مورے سیاں گئے ہیں بدیس موہے چندڑی کون رنگاے اماں میرے باوا کو بھجوری کہ ساون آیا بیٹی تیرا باوا تو بڑھا چوانوں پالتی داشت کارے ایک اچنبا کسوں سبلی والے نبور جی ہمارا بردا مانو نیور جی کس کس گیت کی یات کر کے چھاتی پٹیوں سینکڑوں کے گیت تھے کہ جہاں جمولے میں ننگے اور سب کے نکلتے چلے آتے ختم ہی ہونے پر نہیں آئے۔ سقنیاں ہیں کہ الگ ڈھولکی اور سارنگی کے ساتھ اپنے الاپ رہی ہیں۔ کنڈے جانے والی پیاری ہیں۔ دلی

والے رہے بھی یا نہیں۔ یا نہیں تو وہی سیلانی چھوڑے ہیں جو میرے چھٹپنے میں تھے باہر والوں اور نئی شاشی کے لیے یہ گیت جو میرا ذہن محفوظ رکھ سکا لکھتا ہوں۔ اس سے فرینچ کے کچھ کارنامے معلوم ہوں گے اس زمانے کے شہر والوں کا تو کیا ذکر ہے باہر کے آئے حیوان بھی یہاں انسان بن جاتے تھے۔ یہاں کی زبان ادب آداب تمیز قاعدے سیکھ آدمیوں میں شمار ہونے لگتے۔ خیر شہر کی تو بات ہی اور ہے۔ آس پاس کے گنوار بھی اپنی تک بندی میں مطالبہ کو ایسا ذہن نشین کر دیتے کہ اور جگہ شاید بات بات پر گیت بن جاتے۔ فرینچن سرون کے گیت کی خاص دھن ہے۔ جو سننے ہی سے تعلق رکھتی ہے۔ ہائے اب تو شاید اس کا گانے والا بھی کوئی نہ رہا ہوگا۔ وہ رہی سہی سبھا بھی الٹ گئی۔ شہری شہر بدر ہوئے باہر والے آن گھسے نہ وہ شہر رہا نہ وہ لوگ رہے۔ جب ہم ہی وہاں نہ رہے تو رہا تا کیا لاک اب تو یہ بھی کوئی نہیں بتلا سکتا ہے کہ گاؤں ''گنگانا'' ہے ''گوہانہ'' ہے یا ''نگانا'' ہے اور بہت سے سائیں کے لال ایسے بھی ہوں گے جنھیں یہ بھی نہ معلوم ہو کہ دھولہ کنواں کہاں ہے جانے کس نہیں پہرے سبز قدموں کی بدولت یہ سانتی آئی ہائے دلّی وائے دلّی۔

یہ واقعات میں میں نے سکندر جہاں بیگم صاحبہ مرحومہ سے جو نواب شمس الدین کی بہن کی نواسی تھیں سنے ہیں۔ ان کو میں دادی اماں کہا کرتا تھا اور ان سے بہت مانوس تھا۔ مرحومہ بھی مجھ سے بہت الفت رکھتی تھیں۔ ان کی صاحبزادی اختری بیگم صاحبہ مرحومہ سرامین الدین خاں بہادر نواب لوہارو سے منسوب تھیں۔ بسم اللہ بیوی صاحبہ بنت نواب شیر جنگ بہادر جو میرے نانا نواب نصیر الدولہ احمد حسن خاں سے منسوب تھیں وہ فرینچن اور مرزا شمس الدین کے واقعات سنایا کرتی تھیں اور اکثر شہر کی بڑی بوڑھیوں اور پرانے ثقہ و سنجیدہ لوگوں سے میں نے تمام مذکورہ بالا حالات سنے ہیں۔ گیت ملاحظہ ہو۔

دھڑ کلکتے سے چلا فرینچن پانچوں بیر منائے۔ اللہ جائے رے پانچوں بیر منائے پانچ مقام دلی کے بولے چھٹا گوباڑ گاؤں اللہ جانے رہے چھٹا گوہانہ گاؤں دھولے کنویں پہ تنورے تانے میخیں دین گڑ دوائے اللہ رے میخیں دین گڑوائے پانچ سوار چھٹارے فرینچن سروں ڈسونٹانا جائے، چکوئی سروں کا بصید بنائے ہاتھی دوں گا انعام، اللہ رے ہاتھی دوں گا انعام، سگے پچانے بھید بتایوں سروں باجرے میں، اللہ جانے رے سرن باجرے میں ڈولے ڈولے چلا فرینچن پانچ سوار لے تیسرا مربو پانچ سوار لے۔ پانچ پیسر باجرے کے کاٹے چھٹانہ کاٹا جائے۔ اللہ جانے رے چھٹانہ کاٹا جائے۔ ہاتھ میں گوپیا ڈو گے درانتی ٹولے لگاتی جائے، اللہ جانے رے تولے لگاتی جائے، ہاتھ پکڑ ہاتھی پر ڈالا، سرن روتی جائے، تیرا مریو سرون روتی جائے، امی چندروتا ڈولے سروں میری جائے، تیرا امریو سردن میری جائے، بھائی بھتیجو سبھی جو کنہ مل جائے۔ سرون ملن کی نائے، الٹے سلٹے گودھ دے۔ دی نانی کی پھر نہ گندھاون آئے۔ پیچھے سنار کی بیچ میں سرون جا اللہ جانے بیچ میں سرون جائے آدھی رات پہر کا تڑکا کا تارے گنتی جائے اللہ جانے رے تارے گنتی جائے۔ چھوٹے بگڑتے، چھوٹے بگڑ رہے سرون، نکی بڑے بگڑ کو جاتے، سکھی گلی حیرا سی پھو گئے، گھر گھر تہانے دار اللہ جانے..... دھر کلکتہ سے چلا فرینچن.... پسیڑھی کا بیٹھنا چھوڑ میری سردن کرسی کا بیٹھنا سیکھ۔ اللہ جانے رے..... ہاتھوں سے کھانا چھوڑ میری سردن، چھری کانٹوں سے کھانا سیکھ، اللہ جانے رے..... لہنگا کا پہننا چھوڑ میری سرون غرارے کا پہننا سیکھ اللہ جانے۔

☆☆☆

آغا حیدر حسن مرزؔ

دیباچہ

وقارالنساء بیگم کی کتاب پکوان کا دیباچہ

اللہ یہاں کا صفاتی نام رزاق ہے۔ رزق ہر حیلے دیتا ہے۔ بھوکا اٹھاتا ہے بھوکا سلاتا نہیں پتھر کے کیڑے کو بھی رزق پہنچاتا ہے۔ وہ منعم بھی ہے اس بڑی نعمت تو یہ ہے کہ اس نے اپنے محبوب حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری دنیا جہاں کا شفیع بنایا اور آپ کے ذریعے ہم کو حرام حلال غذا کا فرق سکھوایا۔ سلام ہو آپ کے اہل بیت پر جنھوں نے اکل حلال کھا کھا کر عمدہ نمونہ امت کے لیے پیش کیا۔ آدمی اَن کا کیڑا ہے۔ چھٹپن ہی ہے ہپا کھچی کی دوہائی مچا دیتا ہے۔ حیدرآبادی بچے مموکی دھوم مچاتے اکثر بڑے بوڑھے دنگئی بچوں کو آلو گوشت اور چپاتی سے ڈراتے ہیں۔ ننھے ندان آلو گوشت اور دال چپاتی کو بھی ہوّا، بی شادی یا بی گربلی سمجھ کر سہم جاتے ہیں۔ انھیں کیا معلوم کہ بڑے ہوں گے اس دال چپاتی اور آلو گوشت کے لیے گھاٹ کا پانی پینا پڑے گا اور ور ور کی ٹھوکریں کھانی پڑیں گی ایانے سے ذرا سیانے ہوئے تو کسی بڑی بوڑھی نے چڑے چڑیا کی کہانی سنانی شروع کی۔ اس میں یہی کھانے کا نام پہلے آتا ہے۔ چڑا الا یا چاول کا چڑیا لائی مونگ کا دانہ، دونوں نے مل کر کھچڑی پکائی وہی کھچڑی ہے جس کی بھد اور خواری حضرت بادشاہ غازی نے اڑائی ہے۔ ہندوستان میں مغل سے پہلے کے ترک اور پٹھان یہاں کی کھچڑی کھاتے تھے۔ کھچڑی پکنے میں جو کھد بدکھد بد ہوتی ہے۔ بڑی بوڑھیاں کہا کرتی ہیں کہ مغل پٹھان ہیں۔ سب سے پہلے ہنڈکلیا میں کھچڑی ہی پکانا سکھائی جاتی ہے۔ پہلے کی بچیو کے لیے کھچڑی علم طباخی کا بغدادی قاعدہ تھا باوا آدم اور اماں جنت سے گیہوں کھا کر نکالے گئے۔ اُن کی دنیا میں پھل پھلاری کھا کھا کر جیتی رہی۔ جب آگ کا علم ہوا تو ترکاریاں ابلیں اور گوشت بھنے۔ انسان بلاخور ہے۔ کوئی چیز نہ چھوڑی پتھر کا سالن پکایا، لکڑی کے مربے تربیت دیے، کاٹھ کے اچار ڈالے درندوں، چرندوں کی غذائیں اس کالے سروالے نے سب چٹ کیں۔ پرندوں کے گھونسلے تک نہ چھوڑے جو اس کو چیرتے پھاڑتے گزند پہنچاتے ان کو بھی ہڑپ کر گیا۔ حد کی کہ اپنی جنس کو بھی کھانے لگ گیا کسی نے بدتہذیبی سے کھایا آدم خور کہلایا۔ کسی نے مہذب بن کے لموڑا اور اف نہ کرنے دی۔ قدیم قوموں سے مصری، چینی، ہندی، ایرانی اور کلدانی، اسیری، یونانی اور رومی اپنے کھانوں کے لیے بہت مشہور ہوئے۔ رومیوں نے بلبل اور مور کی زبانوں کی قابیں کی قابیں دعوتوں مجمانیوں میں صاف کیں۔ کبھی کے ہند کی ان کھائیاں نازک بدن بچ پھولا رانیاں دکھانے کو چڑیا کی جیب اور مانڈے کا پھپھولا کھاتیں تو رومی کھاو کھانے پہ کھانے کھاتے اور نکالتے جاتے۔ ان کے بڑ پیٹے بھائی متھرا کے چوبے اور کھاو وٹ کے کھاتے اور بچاتے۔ بالمیک جی کی رامائن میں بھانت بھانت کے پکوان اور بھوجنوں کے نام ملتے ہیں۔ فارسی مثنویوں میں جہاں دعوتوں کا مذکور ہے وہاں صدہا کھانوں کے نام آجاتے ہیں۔ ہاشمی بیجاپوری کی یوسف زلیخا میں سیکڑوں کھانوں کے نام ہیں۔ ان کھانوں کے ناموں کو جمع کیا جئے تو ہزاروں کھانوں کا قطابہ تیار ہو جائے۔ ملا بدایونی ایک بھیگتے کا حال بیان کرتے ہیں کہ حسن صورت کی بدولت ایک امیر کا منظور نظر بن گیا۔ اور وہ امارت پیدا کی کہ ایک دن شکار میں کوئی امیر اس کے ڈیرے پر نکلا۔ کھانے کا وقت ہو گیا۔ اس نے بے سروسامانی کا عذر پیش کر کے امیر کو کھانے پر شرماتے ہوئے روک لیا۔ صرف آشوں کی تین سو قابیں تھیں۔ اس

سے کھانوں کے تنوع کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ آئین اکبری میں کچھ کھانوں کا رعب نہیں پڑتا۔ سیدھی سادی غذا معلوم ہوتی ہے۔ تکلف تو حضرت صاحب قرآن ثانی کے زمانے سے شروع ہوا، اور حضرت محمد شا بادشاہ غازی کے زمانے میں عروج پر پہنچا۔ بنوامیہ نے طباخی کو ایک مشکل فن بنا دیا اور اس فن پر بے انتہا کتابیں لکھی گئیں۔ ایرانیوں اور ہندوستانوں نے بھی فارسی میں طباخی پر سیکڑوں کتابیں لکھ ڈالیں جو زمانے کی دست برد اور زمانیاں کی ناقدری کی بدولت ناپید ہوتی جاتی ہیں۔ دلی کی تباہی کے بعد جو شہر صوبہ داروں کے یا امیروں کے مستقر تھے۔ وہاں بھی اس فن نے اچھی طرح فروغ پایا۔ مرشد آباد، عظیم آباد، لکھنو، رامپور، فرخ آباد۔ گئی گزری دلی، رہے رہتی دنیا تک حیدرآباد اور ارکاٹ کھانوں کے تکلفات میں مشہور ہوئے۔ لکھنو کے لیے جان عالم و واجد علی شاہ کا زمانہ کھانوں کی ندرت اور نفاست میں شہرہ آفاق ہوا۔ بڑھے بوڑھوں سے سنا ہے کہ واجد علی شاہ کا بکاول ارہر کی دال اشرفی سے بگھارتا تھا۔ علی نقی خاں وزیر نے چغلی کھائی اور سمجھایا کہ کہیں دال بھی اشرفی سے بگھری ہے۔ یہ باورچی دھوکا دے کر لوٹتا ہے۔ واجد علی شاہ نے حکم دیا کہ جب دال بگھاری جائے تو مابدولت خود دیکھیں گے اور کھڑے ہو کر دیکھنے لگے۔ تھوڑی دیر میں اس باورچی نے اشرفی نکال کر پھینک دی اور غصے میں اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور کڑکڑاتے ہوئے گھی کو ایک سوکھا کندا پڑا تھا اس پر الٹ نوکری سے مستعفی ہو روپوش ہو گیا۔ اس اشرفی کو اٹھا کر دیکھا تو ایسی پھس پھسی ہو گئی تھی جیسے گلی چنے کی دال اور دوسرے دن اس کندے میں کوپلیں پھوٹنے لگیں۔ سب کو بڑی حیرت ہوئی۔ واجد علی شاہ کو ایسے کامل فن طباخ کے چلے جانے کا بہت ملال ہوا، اور علی نقی خاں معتوب ہوئے۔ واجد علی شاہ کے بعد رامپور اور حیدرآباد دکن کھانوں کے تکلفات کا مرکز ٹھیرے۔ نواب حامد علی خاں مرحوم کے خاصے کا سفیدہ دور دور مشہور تھا۔ نواب صاحب مرحوم کا دسترخوان بہت وسیع تھا ان کے خاصے کا سفیدہ کوئی ایک چمچے سے زیادہ نہ بچا سکتا۔ چوگنی مٹھاس کسی لاگ سے کھپائی جاتی۔ یہ روغن بادام میں پکایا جاتا۔ علیہ حضرت اماں مہاراج راجہ سندھیا مرحومہ کو بھی پکانے کا بہت شوق تھا مچھلی پکانے اور کانٹا گلانے میں ان کا جواب نہ تھا۔ ہز ہائی نس ہری سنگھ بہادر مہاراجہ کشمیر کو بھی پکانے کا بہت شوق ہے۔ ان کے تمام مصاحب اور دوست احباب شام کو ایک ایک چیز اپنے ہاتھ سے پکاتے اور سب مل کر کھاتے۔ ہاں حضرت بہادر شاہ بادشاہ غازی کو بھی پخت و پز کا بہت شوق تھا۔ بادشاہ پسند کریلے اور بادشاہ پسند دال حضرت ہی کی ایجاد ہے۔ لال حویلی میں چھوٹی ہنڈکلیا اور بڑی ہنڈکلیا روز کا معمول تھا۔ بڑی ہنڈ کلیا شہزادیاں شہزادے۔ سلاطین زادیاں اور سلاطین زادے پکاتے جو حضور کے خاصے میں پیش ہوتی۔ چھوٹی ہنڈکلیا حضرت ظل سبحانی اور ملازمین پکاتے۔ اس میں سے آش اکثر امیروں اور معتبر لوگوں کو سرفراز ہوتا۔ سید علی شاہی رکاب دار جس کی بیوی اللہ جلائی میری نانی حضرت کے پاس مرے دم تک رہی۔ اس کا ایک واقعہ میں نے اللہ جلائی نے سنا کہ ایک روز حضرت جہاں پناہ نے فرمایا کہ سید جب جانیں کہ آم کا مربہ درخت ہی میں ترتیب دے کر ما بدولت کو کھلاو۔ سید علی نے ہاتھ باندھ کر عرض کی حضور کے اقبال سے ایسا ہی ہوگا۔ حیات بخش یا مہتاب باغ مجھے یہ یاد نہیں پڑتا کہ کونسے باغ میں سید علی نے پانچ کریلوں کے گچھے کے نیچے ایک اونچی صندلی رکھی اور ان کریلوں کو شاخ ہی میں چھیلا اور گودا اور نیچے پتیلی رکھ کر ان کریلوں کو ہلکا جوش دیا۔ اس طرح کے وہ زیادہ بھاپ سے گل کر نہ ٹپک پڑیں۔ اور پھر قوام میں ان کو پورو دکیا۔ آٹھ دس دن میں جب وہ دو دفعہ پرود ہو چکا تو صندلی نیچے سے ہٹالی اور حضور میں جا کر عرض کیا کہ جہاں پناہ! مربہ تیار ہے۔ حضرت نے جا

کر ملاحظہ فرمایا سید علی کی تنخواہ قلعہ معلیٰ میں پانچ روپے تھے۔اس کی دو بیٹیاں ایک امراؤ اور دوسری بسم اللہ تھی۔ اومراو کا شوہر آتش باز تھا۔ وہ سب مع بچوں کے سلہا لکوں میں آتش بازی بناتے ہوئے جل گئے۔بسم اللہ زندہ تھی اور بڑی تیز چٹاخ چڑیا تھی۔ میں نے اس سے عمدہ اردو بولتے ہوئے اس طبقے کی عورتوں کو کم سنا ہے۔ ہر بات کے ساتھ ایسا محل اور با موقعے شعر استعمال کرتی کہ ابوالکلام آزاد بھی اپنے مضمونوں میں کیا استعمال کریں گے۔ معلوم نہیں اس بیچاری پر اس افراتفری کے زمانے میں کیا گزری۔ سید کا ایک بیٹا تھا جس کو تمام شہر کے لوگ چیل کا انڈا کہتے اور وہ چڑ کر گالیاں دیتا اور مارتا۔ اس کی دعا بڑی مستجاب سمجھی جاتی۔ اس کا نام رمضان علی تھا اور اکثر شہر والے اس کو مجذوب اور ولی سمجھتے یہ لاولد فوت ہوا۔ حضرت میر محبوب علی خاں مرحوم کے زمانے میں حیدرآباد دکن میں دلی اور لکھنو کے بہت سے باورچی، بکاول اور رکابدار آ گئے تھے۔ اس کی خاطر خواہ یہاں قدر دانی ہوئی اور اس زمانے کے امیروں کو بھی کھانے کا شوق تھا۔نواب فیض مآب جنگ بہادر مہتمم مطبخ تھے اور خود پکانے کے شوقین۔ان کے ہاتھ کا میٹھا بڑا لاجواب ہوتا۔ دلی اور لکھنو کے امیروں اور شریفوں کے لیے یہ لازم تھا کہ وہ کچھ نہ کچھ پکانا جانتے ہوں۔ اور اکثر خاندانوں کے خاص خاص کھانے مشہور تھے۔نواب موسیٰ خاں کے ہاں کا جوزی خاص الخاص بہت مشہور تھا اور دو تین گھان حضرت بادشاہ سلامت کی ضرور نذر کیے جاتے۔ ایک گھان بیس سیر کا ہوتا۔انھیں کے دو بیٹے تھے بڑے بیٹے نواب سیف الرحمٰن المخاطب بہ نواب موسی خاں اور دوسرے بیٹے نواب عبدالحکیم خاں المخاطب بہ نواب عیسیٰ خاں یہ وہی دونوں بھائی ہیں کہ جب بڑے نواب موسی خاں حافظ عبدالرحمٰن خاں احسان کا انتقال ہوا اور ترکے کی تقسیم کا سوال پیدا ہوا تو بڑے بھائی نواب موسی خاں نے چھوٹے بھائی نواب عیسی خاں سے دریافت کیا کہ تم کیا لوگے؟ انھوں نے جواب دیا مجھے سوائے کتاب خانے کے اور کچھ نہیں چاہیے۔ اس پر دونوں بھائی راضی ہو گئے۔ کتاب خانہ نواب عیسیٰ خاں نے لیا اور تمام جواہر اور املاک نواب موسیٰ خاں نے لی۔اس پر دلی والوں نے پھپتی کہی عیسیٰ کا گھر موسی۔نواب عیسیٰ خاں کی آل سے عزیز وقار النساء بیگم اور ان کے شوہر اسد الزماں ہیں۔ اور موسیٰ خاں کی آل سے میں ہوں۔ دلی پیاری کے قدیم شاہی نوابی گھرانوں اور اشرافوں میں کھانے پکانے کا بہت شوق تھا۔مرد عورت سب کھانا پکانا جانتے تھے۔جس کو کھانا پکانا نہ آتا اس کے خاندان میں فی نکالتے یا نو دولتا جانتے۔ میری دادی حضرت کندن قلیہ، کھڑا قورمہ، بادام کا قورمہ، شاہ جہانی چنے کی دال، تنڈوں اور کرم کلے کا قلیہ اور شاہ جہانی قورمہ بہت بے مثل پکاتی تھیں۔ مرتے دم تک ایک ہنڈیا روز اپنے ہاتھ سے پکاتی تھیں۔ان کے پاس ایک فولاد کی ڈھلی ہوئی بہت خوب صورت انگیٹھی تھی جو میرے دادا حضرت انگلستان سے لائے تھے۔ یہ ایک سینی میں ان کی مسند کے پاس رکھی رہتی تھی۔ اور تمام ہنڈیا کے لوازمے پاس رکھے رہتے۔ چھوٹی سی چاندی کی پتیلی اور چاندی کا کفگیر استعمال فرماتی تھیں کہ چاندی گھس گھس کر جسم میں جاتی ہے اور قلب کے لیے بہت مفید ہے۔ اگر شان سمجھی جائے تو اس کے اندر کا پکا کھانا مکروہ ہے۔ میری نانی حضرت بادشاہ پسند کر لیے، شامی کواب، بادشاہ پسند بیسنی روٹی اور مونگ کی پھریری کھچڑی بڑی لاجواب پکاتیں۔ میری بڑی پھپّی سیم کے بھیجے، بامنی بھیا، ٹماٹر اور گڑمبا اور انفس پارے اور پتیلی کے کوفتے بہت تحفہ پکاتی تھیں۔ یہ بھی مرتے دم تک ایک ہنڈیا شل اپنی والدہ کے روز پکاتی رہیں۔ میری چھوٹی پھپّی میٹھے پکانے میں کمال رکھتی تھیں۔ان کے ہاتھ کا مرغو بہ اور مغلعو بہ ایسا ہوتا تھا کہ کبھی اور کہیں نہ کھایا۔لیکن یہ کبھی کبھار ہی پکایا کرتی تھیں۔ میرے نانا حضرت حبشی حلوا سوہن بہت

عمدہ بناتے تھے۔ جاڑے میں چھے سات گھان ضرور تیار کرتے۔ وقار النسا بیگم کی دوہیا ساس امدادی بیگم زوجہ شیر زماں خاں المتخلص بہ صاحب کھیرا اور بریانی بہت عمدہ پکاتی تھیں۔ گوہر بیگم زوجہ میجر عباس علی خاں جو اسد الزماں کی چھوٹی پھوپی تھیں۔ روغنی ٹکیاں بہت عمدہ تلتی تھیں۔ یہ ایسی خستہ اور بھربھری ہوتیں کہ ہونٹوں سے باتیں کرتیں۔ سموسے اور قیمہ بھی بہت عمدہ پکاتی تھیں۔ ان کی چھوٹی صاحبزادی بیگم سید عبدالحی خاں رضوی کو بھی کھانا پکانے کا بہت شوق ہے۔ غرض ہندوستان میں ہندوؤں کی بھجیاں، دالیں، چٹنیاں، اچار، کھیر اور پکوان تو تھے، بالمیک جی کی رامائن میں اکثر کھانوں، میٹھائیوں اور پکوانوں کے نام مل جاتے ہیں۔ ترک اور پٹھان پلاو، قورمے اور دولمے، مختلف قسم کی روٹیاں، حلوے اور کواب لائے۔ مغلوں کے زمانے میں کھانوں کی تعداد ہزاروں ہو گئی۔ جن کے نام اور ترکیبیں قلمی اور مطبوعہ فارسی اور اردو کی کتابوں میں محفوظ ہیں۔ عربوں کے کھانے جدا ہیں۔ وہ بھی ہندوستان میں عربوں کے ساتھ آئے۔ حلیم، ہریسے، مذبح اور حلوے کس نے نہیں کھائے۔ نوائط اپنے میٹھوں کے لیے دکھنیوں میں مشہور ہیں۔ دکھن کے خاص خاص کھانے، مختلف قسم کے کٹ، بگھارے بیگن، اچار، سل کی چٹنیاں، سدھا میں اور ساگ جن کو دکن میں بھاجی کہتے ہیں، طرح طرح کے ہوتے ہیں۔ قطب شاہیوں کے عہد میں بھی ساگوں کا بہت شوق تھا۔ کسی قطب شاہی حرم کو چمکورے کا ساگ چننے میں ایک ہیرا مل گیا تھا۔ یہ اچھے قد و قامت اور رنگ دھنگ کا تھا۔ اس کا نام ہی چمکوڑا پڑا تھا۔ حضرت جہانگیر بادشاہ غازی کی خدمت میں قطب خاں میزبان گولکنڈہ بہ طور نذر کے پیش کرایا تھا۔ توزک جہانگیری میں اس کا مذکور ہے۔

بڑی بوڑھیاں مسالوں سے کھانوں کی اصلاح کیا کرتی تھیں۔ گوبھی بادی سمجھی جاتی۔ اس کی بادی مارنے کو ادرک ضرور ڈالی جاتی۔ گوشت کی گرمی کم کرنے کو دھنیا ڈالتے۔ عزیزہ وقار النسا بیگم نے تمہید میں علوم جدیدہ کی روشنی میں کھانوں کے خواص سے بحث کی ہے۔ مدرس کے لیے روزانہ تین ہزار کیلوری کی ضرورت ہے۔ اتنی ہی کیلوری کی ضرورت دودھ پلانے والی عورتوں کو ہے۔ مجھے استاد اورانا کی مقدار غدا کے ایک ہونے پر ہنسی آئی۔ یہ کتاب گھر گرست بیویوں کے لیے بہت مفید ہے۔ پھوہڑ بھی پڑھے تو سگھڑ بن جائے۔ بعض مردوں کی محبت دل میں نہیں ہوتی۔ پیٹ میں ہوتی ہے۔ جن کی محبت پیٹ میں ہوتی ہے۔ وہ اس کتاب پر عمل کرنے والی بیویوں کے آسانی سے مطیع اور فرماں بردار بن سکتے ہیں۔ اس لیے ان کو الّو یا اشر لوکھلانے کی ضرورت نہیں۔ اس کتاب کو غور سے پڑھیے اور مزے مزے کے کھانے پکایئے اور اپنے شوہروں، باپ بھائیوں دوستوں کو کھلایئے اور اپنے بس میں کیجیے۔ میں نے یہ مقدمہ ہولا جولی میں لکھا ہے۔ دلی کی تباہی نے پراگندہ خاطر کر رکھا ہے۔ اس لیے مضمون میں بے ربطی اور پراگندگی ہوگئی ہے۔ میں نے اس کو جوں کا توں رہنے دیا ہے تاکہ جب دلی کے دن پھریں اور لوگ اس دماکے کو یاد کریں تو میرا یہ مضمون بھی دلی کی تیتر بتر حالت اور تحس نحس ہو جانے کی گواہی دے سکے کہ اس میں بھی خیالات یکجا نہیں تتر بتر اور تحس نحس ہیں۔ دلی کی چول سیدھی بیٹھے۔ تاکہ پھر وہی وسیع دسترخوان چوکیوں پر بچھے ہوں اور ہمہ اقسام کی نعمت چنی ہو اور اللہ کے بندے اور بندیاں دل کے چین سے کھائیں۔ اور اس کتاب کی لکھنے والی کو دعائیں دیں۔

رعائتی نرخ پر

ادیبوں وشاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

حبیب نثار

مضمون

آغا حیدر حسن اور موسیقی

آغا حیدر حسن مرزا، اردو کے ایک نستعلیق ادیب، مبصر اور مقرر تھے۔ ان کے دادا پڑ دادا نے مغلوں اور انگریزوں کو سلیقہ سے حکومت کرنے میں مدد کی تھی۔ آغا حیدر حسن مرزا اپنے اجداد کی موروثی حویلی میں پیدا ہوئے جاگیر دارانہ معاشرت میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ علی گڑھ میں سر سید احمد خاں کے مدرسہ محمدیہ میں تعلیم کی تکمیل کی۔ گردش زمانہ نے انھیں حیدر آباد پہنچایا۔ دہلی میں جب تک رہے لکھنے پڑھنے کا شغل جاری رہا اس کے ساتھ کتابیں اور نوادرات جمع کرنے کی جانب بھی توجہ دی۔ حیدر آباد میں اپنی زبان دانی کی وجہ سے بہت جلد معروف ہو گئے۔

آغا حیدر حسن مرزا دہلی کی بیگماتی زبان خوب بولتے تھے حیدر آباد میں جب ارباب مجاز اور حل وعقد نے دہلی کا محاورہ سنا تو آغا حیدر حسن کو نظام کالج میں اردو کا پروفیسر مقرر کیا کہ حیدر آباد کے طالب علموں کا شین قاف بھی درست ہو جائے۔ آغا حیدر حسن مرزا نے کچھ ہی عرصہ میں حیدر آباد کی ادبی اور تہذیبی دنیا میں اپنا مقام بنالیا۔ نصیر الدین ہاشمی نے دکن میں اردو میں لکھا ہے کہ 'دہلی کی زبان' دہلی کی تہذیب اور دہلی کے مشاہیر کے بارے میں آغا صاحب کی رائے حرف آخر کا حکم رکھتی ہے۔ انہی اسباب وعلایل کی بنا پر ہاشمی صاحب نے آغا حیدر حسن کو ''طوطئ شیریں سخن'' کے لقب سے یاد کیا ہے۔ وہ مزید لکھتے ہیں:

> ''دہلی کی عورتوں وہ بھی شاہی محلات کی بیگمات کی زبان بولنے والا طوطئ شیریں سخن لکھا بہت کم ہے، مگر جب بولنے پر آئیں تو گھنٹوں زبان نہ رُکے۔ دوست پرست، دوست کے ہم درد مخلص، صداقت پسند، صداقت شعار، ظاہر و باطن کی صفائی کے ساتھ تصوف کا مذاق بھی رکھتے ہیں۔ صوفیاء سے دلی عقیدت اور بزرگوں کا ادب، دوستوں سے مروت، چھوٹوں پر شفقت آپ کے معمول ہیں (دکن میں اردو، ص770)

وہ لوگ جو صداقت پسند اور صداقت شعار ہوتے ہیں ان کا ظاہر و باطن ایک ہوتا ہے۔ ایسے ہی اصحاب علوم وفنون کے بھی ماہر ہوتے ہیں۔

آغا حیدر حسن مرزا، مصنفین کی اس نسل سے تعلق رکھتے ہیں جو تمام فنون لطیفہ پر دسترس رکھتے ہیں، ایسے ادیبوں میں میر حسن، دیا شنکر نسیم، انشا اللہ خاں انشا اور مرزا محمد ہادی رسوا کا شمار ہوتا ہے۔ آغا حیدر حسن مرزا کو بھی ایسے ہی ادیبوں میں شامل کیا جانا چاہیے۔ یہاں یہ لکھنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا کہ ابن سینا کا کہنا ہے کہ ''ہم میں کوئی اس وقت تک مکمل تصور نہیں کیا جاتا جب تک وہ موسیقی میں محارت حاصل نہ کرلے'' اس نقطہ نظر سے دیکھا جائے تو آغا حیدر حسن مرزا بھی ایک مکمل ادیب وفنکار تھے۔

آغا حیدر حسن مرزا کی تحریروں میں دو مکمل مضمون موسیقی کے حوالے سے ملتے ہیں (یہ الگ بات ہے کہ کسی نے بھی ان مضامین کا Notice نہیں لیا ہے۔ ایک مضمون نواب جمال الدین خاں صادق جنگ متخلص حلم کی ٹھمریوں کے مجموعہ ''پریت کی

ریت'' پر لکھا مقدمہ ہے جو اس مجموعہ میں شامل ہے دوسرا مضمون وہ ہے جو آغا صاحب نے سلطان عبداللہ قطب شاہ کے گیت کے حوالے سے لکھا ہے۔ پیت کی ریت کے گیتوں کی زبان برج آمیز ہے۔ ہندوستانی موسیقی کے راگ راگنی کے سُر نرم اور ملایم ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ گیت لکھنے والے تخلیق کار برج آمیز زبان کو پسند کرتے ہیں۔ آغا حیدر حسن مرزا نے ''پریت کی ریت'' پر مقدمہ لکھتے ہوئے پہلے پہل برج زبان پر ہی اظہار خیال کیا ہے۔ مضمون کے ابتداء سے دو جملے دیکھئے۔ (مضمون مشمولہ ''ندرت زبان'' مرتبہ مہر النساء معظم حسین)

''دلی پیاری سے لے کر آگرے تک ندی کنارے کا علاقہ برج باجتا ہے۔ حلم پیا کی بانی میں وہ سوز و گداز ہے اور بولوں میں چونچلا ہے کہ سننے سے اچنبھا ہوتا ہے۔ سیدھی سیدھی بولی میں وہ میٹھی میٹھی باتیں کی ہیں کہ تو تیاں ہاتھ پسارتی ہیں (ص،۴۰)

ان دو جملوں میں ''باجتا''، ''بانی'' اور ''بولوں'' ایسے لفاظ ہیں جو موسیقی سے متعلق بھی ہیں۔

باجتا، بجنا سے ہے لغوی معنی میں مشہور ہونا یا موسوم ہونا لیکن دنیائے موسیقی میں اس لفظ کے معنی ہیں مروج ہونا رائج ہونا اسی طرح لفظ بانی کے لغوی معنی ہیں آواز۔ لیکن اصطلاح موسیقی میں اس آواز کو کہتے ہیں جو کسی فرد یا خاندان کی گائیکی یا باج میں انفرادی خصوصیات کے ساتھ امتیازی حیثیت حاصل کر لیتی ہیں جیسے ڈاگر بانی کہ ڈاگر برادران نے اپنی گائیکی میں وہ امتیاز پیدا کیا جو انھیں کے خاندان سے مخصوص ہے۔ آغا حیدر حسن مرزا ان دونوں الفاظ کو انہی معنوں میں برتا ہے۔ بولوں، بول کی جمع کے طور پر استعمال کیا ہے اور ان کے چونچلا ہونے کی بات بتا کر بولوں کی نزاکت کی جانب اشارہ کیا ہے۔ قابل مصنف نے حلم پیا کی راگ گوری میں باندھی ہوئی ایک ٹھمری درج کی ہے۔ دیکھئے

جس پر بیتے وہی جانے
ہوتی بری ہے من کی لاگی
دن تو جوں توں گذر ے لوگو
تارے گن گن رتیاں جاگی
حلم کو دیکھو کچھ مت پوچھو
کس پاپی سے اکھیاں لاگی

حیدرآباد کے وجہی نے کہا تھا 'دکھن ہے نگینہ انگوٹھی ہے جگ'' آغا حیدر حسن مرزا حلم پیا کی اس گوری کے بولوں کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں ''حلم پیا کی گوری کے بول دیکھو کیسے بیٹھے ہیں جیسے انگوٹھی میں نگینہ''۔ مزید لکھتے ہیں۔

''ایک ایک بول تال سم میں بندھا ہے'' (ص،۴۱)

یہاں موسیقی کی تین اصطلاحیں بیان ہوئیں ہیں بول، تال اور سم۔ بول اور سم، سازی اور صوتی موسیقی کے مشترک اصطلاحیں ہیں، بول، گیت کا ایک لفظ اور ساز پر ادا کیا جانے والا لفظ بھی ہے اور سم، راگ کے شروع اور ختم پر آتا ہے اسی طرح تال کی تکمیل کے موقع پر ساز پر ادا کیا جاتا ہے لیکن سم تال میں خصوصی حیثیت رکھتا ہے کہ اسی سے تال کے ماتروں کا علم ہوتا ہے۔ تال کا تعلق R y t h m سے ہے اور پکھاوج، مردنگ طبلہ میں Backbone کی حیثیت رکھتا ہے۔

کسی ادیب کا مطالعہ جتنا وسیع ہوگا وہ اپنی تحریر اور تقریر میں اتنے ہی زیادہ حوالے دے گا۔ یہی صورت محترم آغا حیدر حسن مرزا کی ہے۔ پربت کی ریت پر مقدمہ لکھتے ہوئے انہوں نے

موسیقی سے اپنی واقفیت کا بھرپور اظہار کیا ہے تاریخ موسیقی سے بھی وہ واقف و باخبر نظر آتے ہیں۔ انہوں نے حلم پیا کے راگ گوری میں کہے ہوئے گیت کے حوالے سے گزشتہ تین سو برس میں راگ گوری میں لکھے گئے گیتوں کا ذکر و تذکرہ کیا ہے صرف گیت کے خالق ہی کا ذکر نہیں کیا ہے بلکہ گیت اور اس کے بول بھی درج کیے ہیں چند نام دیکھئے۔ کبیر داس جی (ص،۴۱)، گرونانک جی، ملک حسین شرقی (کذا حسین شاہ شرقی) ابراہیم عادل شاہ جگت گرو'' (ص،۴۱، ندرت زبان)

کہنے کو صرف چار نام ہیں لیکن تین سو برس کی تاریخ پر محیط ہیں۔ یہ چار نام تو آغا حیدر حسن مرزا نے راگ گوری کے حوالے سے لکھے ہیں۔ ان فنکاروں کے علاوہ انہوں نے ذیل کے فنکاروں کے نام لکھے ہیں جو حسب ذیل ہیں۔

''امیر خسرو، شاہ علی گاوں دھنی (جیو گاوں دھنی)، میرا بائی، میر محمدی نیاز، تراب، خوش رنگ، نور عالم، سند پیا، ملک باز بہادر، راحت، گوہر، قدر، حیدر، عمرو پیا، بندادین، محمد شاہ پیا، داود، تبرس پیا، امین دا، محمد افضل اور واجد علی شاہ جانِ عالم پیا، بہادر شاہ ظفر، شوق رنگ پیا۔ (ص۴۱ تا۴۳)

آغا حیدر حسن مرزا نے ''پریت کے ریت'' کے گیتوں کا بغائر مطالعہ کیا ہے کہ ان گیتوں میں بیان کیے گئے مضامین پر بھی اظہار خیال کیا ہے چنانچہ ٹھمریوں میں حلم پیا نے جو چند کہاوتیں باندھی ہیں ان کی انفرادیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ یہاں دو مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ کہاوت ہے۔ تیڑھی لکیر ٹھمری ملاحظہ ہو۔

جارے کٹھن بے مان تو جا
نا جان کے تج کو چھیڑی رے
حلم نیہا کو سمجھی تھی آسان
کھیر ہے یہ تو ٹیڑھی رے

دوسری کہاوت ہے۔

دودھ کا جلا چھاچھ پھونک پھونک کے پیتا ہے۔ ٹھمری ہے

لاج گنوای جس کے کارن
وا کی دھن میں رہتی ہوں
اس جینے سے موت بھلی ہے
کہنے کو تو جیتی ہوں
حلم جلی ہوں دودھ کی ایسی
چھانچ بھی پھونک کے پیتی ہوں (ص۴۴)

ٹھمریوں میں باندھے گئے ان کہاوتوں کی نشاندہی کرتے ہوئے آغا حیدر حسن مرزا موسیقی کے ساتھ ساتھ ادب کا بھی حق ادا کر دیا ہے۔

آغا حیدر حسن مرزا کے مجموعہ ہائے مضامین ''ندرت زبان'' میں ایک مضمون ''سلطان عبد اللہ قطب شاہ سابع والیٔ گولکنڈہ کے گیت'' کے عنوان سے شامل ہے۔ عبداللہ قطب شاہ کے ان گیتوں کا ماخذ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں۔

''ایک قدیم بیاض نواب نصیر الدین خاں بہادر فرزند نواب رحیم یار جنگ مرحوم کی میرے پاس ہے جو درویش محمد بندہ درگاہ کی ہے ۱۰۹۵ کی مہر ہے۔'' (ص۱۷۳)

''کتاب نورس'' کے تعارف میں شمس اللہ قادری لکھتے ہیں اس میں ''سرود ہندی کے قواعد ضوابط قلم بند کیے ہیں'' سید محی الدین قادری زور ''اردو شہ پارے'' میں ایسے ''اردو میں ایک لمبی

نظم ''قرار دیتے ہیں۔یہی صورت حال گراہم بیلی وغیرہ کی ہے لیکن آغا حیدرحسن مرزا کوعبداللہ قطب شاہ کے گیتوں کو سمجھنے میں کوئی تسامح نہیں ہوا ہے وہ بیاض کا تعارف کرواتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس میں سلطان عبداللہ قلی قطب شاہ کی بنائی ہوئی راگنیاں ہیں۔جن کو نقش سے تعبیر کیا گیا ہے۔اور ہر نقش کے مقام راگ یا راگنی میں بتا دیا ہے۔یعنی یہ گیت ہیں جو سلطان عبداللہ قطب شاہ نے بنائے ہیں اور جن راگ راگنیوں میں گائے جانے چاہیں وہ راگ راگنیاں لکھ دی گئی ہیں۔''(ص،۱۷۳)

یہاں ان گیتوں کی جو صحیح صورت حال ہے اس کو واضح کر دیا ہے کہ یہ گیت ہیں اور مخصوص راگ یا راگنی میں گائے جانے چاہیے۔ آغا حیدرحسن مرزا کی یہ وضاحت دراصل موسیقی کی مبادیات سے ان کی واقفیت کی دلیل ہے۔

مندرجہ بالا اقتباس میں نقش اور مقام کا ذکر آیا ہے یہ دراصل ایرانی موسیقی کی دو اصطلاحیں ہیں مقام تو راگ اور تال کے معنی میں مستعمل ہے اور نقش دراصل ایرانی موسیقی میں راگ/راگنی کا قایم مقام ہے۔

آغا حیدرحسن مرزا نے عبداللہ قطب شاہ کے متعدد گیت اپنے مضمون میں بطور سند درج کیے ہیں اور ساتھ ہی ان تمام راگ راگنی کے نام درج کیے ہیں جن میں گیت کار نے گیت قلم بند کیے ہیں۔عبداللہ قطب شاہ کے گیتوں کے اجزائے ترکیبی سے بحث کرتے ہوئے کتاب نورس کے گیتوں کے اجزائے سے تقابل کیا ہے اور بات سے بات نکلی تو دور تک چلی آئی اور واجد علی شاہ کی موسیقی کے مضامین پر لکھی گئی تین کتابوں تک جا پہنچی ہے۔(ص،۱۷۵)

قصہ کوتاہ۔آغا حیدرحسن مرزا نے موسیقی پر اظہار خیال کرتے ہوئے بھی دون کی لی ہے اور اپنے قلم کا حق ادا کیا۔کاش وہ اس فن لطیف کی جانب مزید توجہ دیتے اور ہندوستانی موسیقی کے بہت سے فنکار اور تصانیف منظر عام پر آجاتیں لیکن جہاں کہیں انھیں اس فن لطیف پر اظہار خیال کا موقع ملا انھوں نے کھل کر بہت واضح انداز میں اس فن پر لکھا ہے۔جیسے روشن اختر پر لکھے گئے مضمون میں بھی موسیقی کے فن کاروں اور سازوں کا بیان ہوا ہے۔

فن موسیقی کے حوالے سے آغا حیدرحسن مرزا نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہماری ادبی روایت کا حصہ بن گیا ہے۔اللہ بس باقی ہوس۔

☆☆☆

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

شاہد حسین زبیری

خواب تھا جو کچھ کہ دیکھا

ایسا شخص نہ پہلے کبھی دیکھا نہ آئندہ دیکھنے کی توقع ہے سرخ وسفید رنگت اطلس کا رنگین پاجامہ ہمرویا جامہ وار کی خوش رنگ گل بوٹوں کی اچکن چوخُمی ٹوپی (سلاطینِ مغلیہ کے طرز کی) چہرے پر بھری ہوئی کھچڑی داڑھی (جسے وقت کے ساتھ ہم نے سفید ہوتے ہوئے دیکھا) ہاتھ میں کپڑوں کے رنگ کی مناسبت سے تسبیح۔ یہ حلیہ دنیائے اردو کی ہر دل عزیز شخصیت آغا حیدر حسن مرزا مرحوم کا تھا۔

اپنی طرف متوجہ کرنے کیلئے تو یہ حلیہ ہی کافی تھا مگر نظر پڑنے پر انکی شخصیت دیکھنے والوں کو مرعوب کئے بغیر نہ رہتی اور اگر سامنے والے کو بات کرنے کا موقع مل جاتا تو سونے پر سہاگہ سمجھئے۔ وہ انداز گفتگو، جملوں کی بندش، الفاظ کی نشست وبرخاست، میری نسل کے لوگوں نے تو کیا پیشرو نسل نے بھی نہ مشکل سے ہی سنی ہوگی۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی جیسی اردو ادب کی قد آور شخصیت بھی آغا صاحب کے انداز وبیان اور زبان کی خوبصورتی کا لوہا مانتی تھی۔ مجھے اپنے بچپن کا سنا ہوا آغا صاحب کا ایک جملہ آج بھی یاد ہے' 'قابل ترین ولایت پاس شدہ، سرخ، زرد، سبز، ریشمی دھجیاں گلے میں لٹکا کر ٹائی ٹائی کہیں تو کسی کو کوئی اعتراض نہیں مگر نگوڑا آغا حیدر حسن اگر اطلس یا شیمو کا پاجامہ زیب تن کرلے تو سب ناک پر انگلی دھر لیتے ہیں''۔

مرحوم کا دعویٰ تھا کہ وہ قلعہ معلیٰ کی بیگماتی زبان میں گفتگو فرماتے ہیں۔ اس دعوے پر بعض لوگوں کو نجی محفلوں میں یہ سوال اٹھاتے سنا تھا کہ کس طرح یقین کیا جائے کہ آغا صاحب جو زبان بولتے ہیں وہ خواہ حقیقتاً قلعۂ معلیٰ کی بیگماتی زبان ہے یا خود انہوں نے اپنا ایک انداز بنا رکھا ہے۔ جسے وہ اس زبان کا نام دیتے رہے ہیں۔ دلی کی بیگماتی زبان کے تو نمونے کئی کتابوں میں مل جاتے ہیں مگر قلعۂ معلیٰ کی بیگماتی زبان پر لکھا گیا کوئی نسخہ منظر عام پر نہیں آیا۔ اس سوال نے مجھے بھی پس وپیش میں ڈال رکھا تھا۔ میں جانتا تھا کہ آغا صاحب کو غلط بیانی کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ میری اور انکی عمر کا فرق اور تعلقات کی پاس داری نے مجھے کبھی اتنی ہمت نہ جٹانے دی کہ ان سے اس بابت سوال کرسکوں۔ مجھے یہ سوال اس وقت تک پریشان کرتا رہا جب تک مجھے دلی کے قدیم خانوادوں سے تعلق رکھنے والی خواتین کی گفتگو سننے کا موقع نہیں ملا۔ جب میں نے دلی کے نواب فیض احمد خان اور نواب عزیز احمد خان کے خاندان کی بزرگ خواتین کی گفتگو سنی جن کے اجداد کا راست تعلق قلعۂ معلیٰ سے رہا تھا تو آغا صاحب کی گفتگو کی کچھ جھلک ضرور نظر آئی۔

آغا صاحب کی شخصیت حیدرآباد کے سماجی، ثقافتی اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی طور پر معروف رہی۔ بعض لوگوں کا تو یہاں تک کہنا تھا کہ اگر کوئی سیاح حیدرآباد آئے اور آغا صاحب سے نہ ملے تو گویا اس نے مکمل حیدرآباد دیکھا ہی نہیں اور یہ بات خود حیدرآبادیوں پر بھی صادق آتی ہے۔ اس مقبولیت کے پیچھے صرف آغا صاحب کی زبان دانی، ان کے لب ولہجہ کا بانکپن اور ادبی حیثیت نہ تھی بلکہ ان کے مزاج کی گرم جوشی اور بے لوث خلوص بھی کارفرما تھے۔ مجھے یہاں ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ جب میں نے اعلیٰ حضرت بندگانِ عالی والا شان نواب مکرم جاہ بہادر کی ملازمت شروع کی تو وہاں کے ماحول میں ایک خاص بات محسوس کی۔ اگر وہاں پر کام کرنے والوں کا کوئی واقف کار اعلیٰ حضرت سے شرف ملاقات کے لئے حاضر ہوتا اور اس کی نظر اپنے واقف کار پر پڑ جاتی

تو وہ پوری کوشش کرتا کہ اس کے اور اپنے روابط کا اظہار اعلیٰ حضرت کے سامنے نہ ہو۔ تاوقتیکہ اسے یقین نہ ہو جائے کہ اس کا مقام اعلیٰ حضرت کی نظروں میں کیا ہے۔ یہ بات مجھے ہمیشہ کھٹکتی رہی۔ شروع شروع میں میرے ایک واقف کار جو وہاں ایک اعلیٰ عہدہ پر فائض تھے مجھے دیکھ اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا تھا۔ مگر آغا صاحب کی شخصیت جداگانہ تھی۔ ایک بار وہ شب کے خاصے پر اعلیٰ حضرت کے پاس مدعو تھے اور اتفاق سے میں بھی خاصہ پر ساتھ تھا۔ جب اعلیٰ حضرت نے مجھ سے آغا صاحب کو شفقت سے گفتگو کرتے سُنا تو دریافت فرمایا، ''آپ شاہد سے واقف ہیں؟'' آغا صاحب نے کہا، ''ان کا کیا ہے میں تو ان کے بزرگوں سے بھی واقف ہوں۔ یہ بچہ تو میرے لئے میرے نواسوں کی طرح ہے۔ جان کی امان پاؤں تو عرض کروں کہ اللہ تعالیٰ نے ایک شریف النسل نجیب الطرفین کو آپ کی خدمت کے لئے بھیج دیا۔''

یہ جملہ میں نے محض اس لئے لکھا ہے کہ آغا صاحب کا مزاج لوگوں کے سامنے آسکے۔

اُس دن مجھے یہ احساس بھی ہوا کہ اعلیٰ حضرت اور آغا صاحب میں کس حد تک بے تکلفی تھی۔ اعلیٰ حضرت کی خواہش تھی کہ آغا صاحب بہت بے تکلفی سے اور آرام سے خاصہ تناول فرمائیں۔ لہٰذا آغا صاحب سے فرمایا، ''آپ ٹوپی اتار کر آرام سے بیٹھیں۔'' آغا صاحب نے ٹوپی اتارنے میں پس وپیش کیا۔ جس پر اعلیٰ حضرت سمجھے کہ آغا صاحب تکلف سے کام لے رہے ہیں۔ لہٰذا شدّت سے اصرار فرمایا۔ آغا صاحب نے اپنی مرضی کے خلاف ٹوپی اتار دی، دیکھتے ہیں کہ جیسے ہی آپ نے ٹوپی اتاری یوں لگا جیسے چنبیلی کے پھولوں کی بارش ہوگئی ہو، جناب کی ٹوپی میں چنبیلی کے پھول بھرے ہوئے تھے۔

ایک مرتبہ آغا صاحب کے بارے میں اعلیٰ حضرت فرمانے لگے یہ دیکھنے میں جیسے بھولے ہیں ویسے ہیں نہیں۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب شہزادی اسریٰ بیاہ کر حیدرآباد آئیں تو اردو سے بالکل ناواقف تھیں۔ آغا صاحب نے اعلیٰ حضرت کی مشکل آسان کردی، اور کہنے لگے آپ بالکل فکرمند نہ ہوں شہزادی صاحبہ کو اردو سکھانا میری ذمہ داری ہے۔ چنانچہ چران پیالس سے روز گاڑی جاتی اور آغا صاحب شہزادی صاحبہ کو اردو سکھانے چلے آتے۔ ہفتہ عشرہ بیت گیا اور شہزادی صاحبہ اردو کا ایک لفظ بھی نہ سیکھ پائیں۔ اعلیٰ حضرت حیرت میں تھے کہ آغا حیدر حسن جیسا معیاری استاد، شہزادی کو اردو پڑھائے اور شہزادی اس زبان کا ایک لفظ بھی نہ سیکھ پائیں۔ ایک دن اعلیٰ حضرت نے طے کیا کہ ذرا میں بھی تو دیکھوں کہ آخر کیا اردو پڑھائی جارہی ہے اور وہ خاموشی سے دروازے کی اوٹ میں کھڑے ہوگئے۔ دیکھتے کیا ہیں کہ آغا صاحب تو شہزادی کو اردو نہیں سکھا رہے ہیں، البتہ شہزادی صاحبہ جناب والا کو تر کی ضرور سکھا رہی ہیں۔ اعلیٰ حضرت کمرے میں داخل ہوئے اور آغا صاحب سے فرمایا کہ اب آپ کو شہزادی کو فیس دینی پڑے گی۔ کیوں کہ وہ آپ کو تر کی سکھا رہی ہیں۔

مجھے جب بھی موقع ملتا میں کچھ دیر کے لئے آغا صاحب کے پاس چلا جاتا۔ موصوف کے پاس جو بھی مٹھائی ہوتی اس سے ضیافت فرماتے۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوا ہے کہ گھر میں کوئی مٹھائی موجود نہ ہوتی اور اس دور کے بنجارہ ہلس سے کسی ملازم کو بھیج کر مٹھائی منگوانا جوئے شیر لانے سے کم نہ تھا۔ لیکن کبھی ایسا نہ ہوا کہ میں اُن کے ہاں سے بغیر ضیافت کے لوٹا ہوں۔ وہ ملازم سے کہہ کر میٹھی روٹی بنواتے اور اس میں بالائی ملا کر بڑی شفقت سے فرماتے میاں اصل شاہی ٹکڑے تو یہ ہیں۔ ایک مرتبہ شہزادی اسریٰ کو اچانک لندن جانا پڑا۔ مجھے بلا کر فرمایا، ''آپ آغا صاحب کے پاس جائیں، میرا سلام کہیں اور بتائیں، مجھے افسوس ہے کہ اچانک عزم سفر کی وجہ سے میں نہ مل سکی اور یہ لفافہ انہیں دے دیں۔''

میں لفافہ لے کر موصوف کے پاس پہنچا تو کہنے لگے ''بہت عرصہ کے بعد اپنا چاند سا چہرہ دکھایا۔ کہاں بدلیوں میں چھپے ہوئے تھا۔''

میں نے عرض کیا، ''اعلیٰ حضرت اور شہزادی صاحبہ دونوں آئے ہوئے تھے۔ لہٰذا اس عرصہ میں کچھ زیادہ مصروفیت رہی۔'' میری بات سنکر کہا، ''اچھا یہ بتاؤ کہ صاحب اور شہزادی صاحبہ کا قیام کب تک ہے؟''

میں نے عرض کیا شہزادی صاحبہ تو آج چلی گئیں' البتہ اعلیٰ حضرت ابھی یہیں ہیں۔ سنکر فرمایا ''اللہ کا شکر کہ شہزادی صاحبہ خیر سے سدھاری۔ اللہ انہیں ساتھ جان کی خیریت سے پہنچنا نصیب کرے''۔ میں نے عرض کیا شہزادی صاحبہ نے مجھ سے فرمایا کہ آپ کو ان کے جانے کی اطلاع کردوں اور ان کا عطا کردہ یہ لفافہ آپ تک پہنچادوں۔

یہ سننا تھا کہ آغا صاحب یوں گویا ہوئے ''برخوردار ایسی خبر سنانے میں دیر نہیں کرتے۔ اس خبر سے ہمارا دل خوشی سے بلّیوں اچھلنے لگا اور ساتھ ہی ساتھ خوف سے لرزنے بھی۔ شہزادی کا بھیجا ہوا لفافہ جس میں فرمان ہوگا وہ قتل کا ہے یا حیات کا یہ تو اللہ ہی بہتر جانے'، مشکل یہ ہے کہ لفافہ فوری کھول بھی نہیں سکتا چونکہ شہزادی کی طرف سے آیا ہے پہلے چوموں گا، آنکھوں سے لگاؤں گا، تب کہیں جا کر کھولونگا۔ اتنی دیر میں دل کا کیا حال ہوگا یہ تو اللہ ہی بہتر جانے۔ اللہ خیر کا معاملہ کرے۔ یہ کہہ کر لفافے کا بوسہ لیا، آنکھوں سے لگایا پھر کھولا اور فرمایا، ''اس میں تو شہزادی کی طرف سے سوغات ہے۔''

میں نے بچپن میں آغا صاحب سے دو کہانیاں بھی سنی ہیں جنہیں سنانے سے پہلے انھوں نے فرمایا تھا یہ وہ کہانیاں ہیں جو میں نے شہزادی اور چاند کو بچپن میں سنایا کرتا تھا' یہ دونوں آغا صاحب کے صاحبزادی اور صاحبزادے ہیں۔ شہزادی خالہ یعنی محترمہ مہرالنساء جو نواب میر معظم حسین صاحب کی بیگم ہیں' اور چاند ماموں یعنی آغا سرتاج حسن مرزا۔ وہ دو کہانیاں گلہری کی اور پودنا پودنی کی تھیں۔ گلہری کی کہانی تو میرے ذہن میں پوری طرح نہیں، البتہ پودنا اور پودنی کی کہانی مجھے آج بھی اچھی طرح سے یاد ہے۔ شاید اسکی وجہ یہ ہو کہ یہ کہانی میں نے اپنی نانی مرحومہ سے بھی کئی بار سنی تھی۔ اس کہانی کا ایک حصہ یہاں لکھ رہا ہوں:

''جب راجہ پودنی کو لیکر چلا گیا اور پودنے کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے ایک سرکنڈے کی گاڑی بنائی اس میں دو مینڈک جوتے اور اپنی پودنی کو لینے کے لئے راجہ کے محل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں ندیا پڑی۔ ندیا نے پوچھا پودنے ماموں پودنے ماموں کہاں چلے؟ پودنے نے کہا سرکنڈے کی میری آڑی گاڑی اور مینڈک کے دو بیل راجہ نے میری پودنی چھینی اس کو لینے جاتا ہوں۔ ندیا نے پوچھا پودنے ماموں پودنے ماموں میں بھی چلوں؟ پودنے نے کہا چل گھس میرے کان میں۔ یہ کہتے ہی ندیا کا سارا پانی سائیں سائیں کرتا پودنے کے کان میں گھس گیا''۔

اس کہانی کا ایک حصہ لکھنے کا مقصد یہ ہے کہ آغا صاحب جو کہانیاں سناتے ان میں عام انداز نہ ہوتا بلکہ اپنا مخصوص طرز بیان ہوا کرتا' کہانی ہو یا کوئی واقعہ اسکی محاکات' منظر کشی' الفاظ کی جادوگری اور سماں باندھنے کا انداز آغا صاحب کے لئے بچوں کے کھیل سے زیادہ کچھ نہ تھا۔

آغا صاحب تہذیب و معاشرت زبان و بیان اور لہجۂ رنگین کے گویا بادشاہ تھے۔ چاہے' دہلی ہو یا لکھنؤ' علی گڑھ ہو یا حیدرآباد سب کے یہاں کی تہذیبی قدریں آغا صاحب میں موجود تھیں۔ جن کو انھوں نے مغلئ تہذیب میں بڑی خوبصورتی سے سمو رکھا تھا۔ آغا صاحب کی شخصیت اس امتزاج کی آخری شمع تھی۔

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

فریدہ تبسم

مضمون

آغا حیدر حسن کی بیگماتی زبان کی لطافت

میری خوش نصیبی ہے کہ مجھے آغا حیدر حسن مرزا جیسی شخصیت پر کام کرنے کا شرف حاصل رہا ہے۔آغا حیدر سے میں اس لیے بھی متاثر رہی ہوں کہ آغا کی تحریر ہو یا گفتگو اس میں عجیب سی رعنائی اور کشش ہے جو کسی بھی شخص کو ان کا گرویدہ بنا دیتی ہے یہی وہ کیفیت تھی جس کی وجہ سے میں نے ان پر ریسرچ کرنے کا ارادہ کیا۔آج بلاشبہ مجھے یہ کہتے ہوئے فخر محسوس ہوتا ہے کہ آغا حیدر حسن جیسے ممتاز و بلند پایہ ادیب پر تحقیق کرنے اور ڈگری حاصل کرنے کا مجھے اعزاز حاصل ہوا۔میری اس تحقیق کے دوران محترمہ مہرالنساء بیگم، داماد جناب میر معظم حسین صاحب آغا حیدر کے نواسے میر اصغر حسین اور ان کے ریسرچ سنٹر کا بھرپور تعاون رہا۔جس کی بدولت مجھے مواد کی فراہمی میں آسانی ہوئی۔

ہر ادیب کا اپنا انفرادی اسلوب ہوتا ہے اسی اسلوب سے اس کی پہچان وشناخت بنتی ہے۔آغا حیدر حسن کی شناخت ان کی بیگماتی زبان کی دلکشی و لطافت کی وجہ سے ہے وہ اردو کے بلند پایہ انشا پرداز ہیں انھیں دلّی کی ٹکسالی زبان اور قلعہ معلّٰی کی بیگماتی زبان پر مکمل دسترس حاصل تھی اردو زبان و ادب کے بے شمار محاورے، کہاوتیں، ضرب الامثال اور فقرے انھیں زبانی یاد تھے۔ دہلی کے شاہانہ خاندان میں ان کی پرورش ہوئی تھی اور یہی وجہ ہے کہ وہ عربی، فارسی اور اردو سے مکمل واقفیت رکھتے تھے۔خصوصاً نسوانی زبان کی لطافت کا مزہ اگر کسی ادیب کے یہاں لیا جا سکتا ہے تو وہ بلاشبہ آغا حیدر حسن کی زبان ہوگی۔

آغا حیدر حسن نے اردو کی تقریباً تمام اصناف میں طبع آزمائی کی ہے۔ان کے سنجیدہ و تحقیقی مضامین کو چھوڑ کر دیگر اصناف مثلاً خاکے ہوں یا انشائیے، طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہوں یا ڈرامہ یا سفرنامہ تقریباً ہر جگہ ہمیں ان کی زبان کی شگفتگی و بذلہ سنجی کا لطف ملے گا۔آغا حیدر خود بذلہ سنج اور شوخ طبیعت کے مالک تھے اور یہی وجہ رہی ہے ان کی طبیعت کی شوخی اور شگفتگی ان کی تحریروں میں بے ساختگی سے آ گئی ہے۔وہ اپنے مضامین اپنی مخصوص محاورتی زبان اور اس کی رنگینی ولطافت کی بدولت قاری کی توجہ کو اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں۔

آغا حیدر کی اسی خصوصیت پر روشنی ڈالتے ہوئے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے اپنی کتاب'' آشفتہ بیانی میری'' میں ان کی بیگماتی زبان کی ستائش کی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

> '' دلی کی زبان بالخصوص بیگمات کی دلی کے کوچے دلی والوں کی سیر وتفریح شادی، طور تہذیب رسم و رواج، پہننے اور اوڑھنے، اُٹھنے بیٹھنے سے جتنے یہ واقف ہیں شاید ہی کوئی اور ہو ۔اس زمانے میں میر باقر علی داستان گو سے ہم سب نے کئی داستانیں علی گڑھ میں سنی تھی اور آغا حیدر حسن مرزا کی زبان سے دلی کے شریف گھرانوں کے معمولات زندگی کی روئداد بھی گفتاری اور داستان گوئی کا موازنہ کیا لیکن اتنا ضرور کہوں گا کہ جتنا لطف باقر علی کی داستان گوئی میں آیا اس سے کہیں زیادہ آغا

حیدر حسن کی گفتگو میں آتا تھا'' ۔[1]

آغا حیدر کی طبیعت میں شوخی، بذلہ سنجی اور شگفتگی کی بدولت ان کی تحریروں میں ہر جگہ تازگی و شگفتگی اور لطافت کے عناصر ملتے ہیں۔ آغا حیدر کو اس طرز کو اپنانے کی ایک وجہ یہ بھی رہی تھی کہ دہلی کی تباہی و بربادی کو انہوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اپنی زبان اور تہذیب کے ختم ہونے کا بھی انھیں افسوس رہا شاید یہی وہ حالات تھے جنھوں نے انھیں اپنی زبان کی حفاظت کرنے کی طرف راغب کیا اور ان بے شمار محاوروں، کہاوتوں، ضرب الامثال تشبیہات و استعارات اور فقروں کو جو اس عہد میں بیگماتی زبان کی صورت میں رائج تھیں، ان کے تحفظ کا بیڑا اُٹھایا۔ آغا حیدر کا بچپن چوں کہ بیگمات کے درمیان گزرا۔ شاہی محلات میں جن کے زیرسرپرستی ان کی تربیت ہوئی وہ ان کے گھر کی ماما تھی، گھر کے تمام امور میں ان کا دخل تھا۔ آغا انھیں دادا حسینی کہتے تھے۔ آغا کی شخصیت کو سنوارنے میں بھی انھیں کا ہاتھ تھا، آغا انھیں سے کہانیاں، قصے، پہلیاں، محاورے وغیرہ سیکھے تھے۔ اس کے علاوہ رسم ورواج کے طور طریقے اور آداب نشست وسلیقہ مندی ان ہی کی زبان سے آغا نے دنیا بھر کی کہاوتیں ضرب الامثال، محاورے اور پہلیاں سنی تھیں اور انھیں کی محبت کا فیض تھا کہ یہ سارے محاورے انھیں ازبر ہو گئے اور وہ بلا تکلف اپنی تحریروں کے ذریعہ افسانوی انداز میں دلچسپ بنا کر ہماری نسل کو منتقل کرنا چاہتے تھے اسی لیے انھیں پرانی اور نئی نسل کی درمیانی کڑی کہا گیا ہے۔ فاطمہ عالم علی، آغا حیدر کی زبان کے ذریعے کی گئی خدمت کو دلی کی گمشدہ تہذیب کی جیتی جاگتی صورت کہا ہے۔ وہ لکھتی ہیں:

''آغا حیدر حسن آثار قدیمہ نہیں بلکہ دلی کی گمشدہ تہذیب کی جیتی جاگتی صورت تھے وہ ایک ایسی کڑی تھے جو ایک نسل کے ورثے کو دوسری نسل سے جوڑتی ہے''۔[2]

آغا حیدر کو نہ صرف بیگماتی زبان لکھنے پر عبور حاصل تھا بلکہ انھیں عورتوں کی حرکات وسکنات، رکھ رکھاؤ اور ان کی نفسیات، لباس، زیوارات، بناؤ سنگھار کا طریقے، ان کے شادی بیاہ، اور دیگر رسومات وعقائد سے دلچسپی وغیرہ سے متعلق بہت سی باتوں کا علم تھا یہی وجہ ہے کہ انہوں نے بڑی خوبصورتی سے بیگمات کی زندگی سے متعلق تمام پہلوؤں کی عمدہ عکاسی کی ہے اس سلسلے میں آغا کے یہاں ''دہلی کی بیگمات'' اور ''میرے چھوٹپن کی دہلی'' جیسے مضامین کے ذریعے بیگمات کی زندگی سے جڑی تمام چیزوں کا ذکر بڑی خوبی سے کیا ہے۔ ان مضامین میں ہمیں بیگمات کے زیوارات ان کے لباس ان کے رسم ورواج ان کے بناؤ سنگھار کے طریقے غرض انہوں نے اپنے اسلوب کی ندرت اور طرز تحریر کے کمال کے ذریعہ ایسی منظرکشی کی ہے کہ یہ بیگمات جیتی جاگتی چلتی پھرتی ہماری نظروں کے سامنے متحرک نظر آئیں گی۔ مثلاً ''دہلی کی بیگمات'' سے ایک اقتباس دیکھیئے جہاں بیگمات کو بناؤ سنگھار کرتے دکھایا گیا ہے۔ جس سے اس عہد کی تہذیب و معاشرت کی جھلکیاں نظروں میں گھوم جاتی ہیں۔ اقتباس ملاحظہ ہو:

''بیگم صاحب کا بناؤ سنئے، کھجوری چوٹی گوندھ مباف دانی میں سے جوڑے کے رنگ پر کھلنے والے رنگ کا مباف نکال۔ ڈالا۔ مانگ بھری۔ افشاں چنی۔ بیگم صاحب نے سیپ کے سفوف کی پوٹلی سے منہ پر سفوف مل کر باریک ململ سے برابر کیا۔ پھر روئی سے شہاب لے کر رخساروں پر غازہ لگایا۔ پپوٹوں پر اور حدقہ چشم

پر ہلکا ہلکا افیم زعفران اور رسوت کا لیپ کر کے آنکھوں میں حلقے بنائے ۔ دنبالے دار سرمہ لگا یا۔شہاب سے دو خطہ دنبالے سے زاویہ بناتے ہوئے اوپر نیچے کھینچے کہ آنکھ مچھلی بن گئی۔کاجل سے بھویں بنائیں کن پٹیوں پر گو ندلگا جڑاویا کا چوبی نزلے بند چپکائے۔بانچھ پر بالاائی لب سے ہٹا ہوا مخملی تل لگایا۔کتھا چونا ملا لاکھا بنایا اور سلائی سے ہونٹوں پر باریک خط لاکھے کا کھنچا۔اس پر مسی کی تحریر سلائی سے دی جامدار خانے والی نے جوڑوں کے دست بغچے حاضر کئے ۔موسم اور رات کے اعتبار سے کھلتا ہوا رنگ پسند کیا' پیش خدمتوں نے اوٹ کھڑی کی ۔ پوشاک بدلی' مشاطہ نے مدد دی۔ مشاطہ کا کام مغلائیاں ہی میرے زمانے میں کرنے لگی تھیں ۔ چاندی کی ہشت پہل انگیٹھی میں سونے کی سلائی گرم کی اور اس پر لٹوں کو لپیٹ حلقے بنا چھوڑ دیئے ۔ زلفیں بنائیں' کالا دانہ اتار آگ میں ڈالا دیکھنے والیوں کی نظر نہ لگے''۔۳

مندرجہ بالا اقتباس کو پڑھ کر اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ آغا حیدر بیگماتی زبان پر کمال کی نظر رکھتے تھے۔انھیں اپنے زمانے کی ہر چیز یاد تھی انھیں نہ صرف بیگماتی زبان سے عشق کی حد تک لگاؤ تھا بلکہ اپنے عہد کی تہذیب سے بھی رقبت تھی۔آغا حیدر کو منظر نگاری میں بھی کمال حاصل تھا۔اسی سبب انہوں نے جزئیات نگاری کے ذریعہ چھوٹی چھوٹی چیزوں کا بڑا عمدہ نقشہ کھینچا ہے۔

آغا حیدر نے ان محاوروں، کہاوتوں اور پہلیوں وضرب الامثال کے ذریعہ عورتوں کی عادتوں ان کے کوسے دعاؤں اور گالیوں کو بھی پیش کر دیا ہے مثلاً ''نقص تربیت'' میں انہوں نے ایک ماں کے کردار کے ذریعہ جسکی بیٹی کو ایک لڑکے نے مارا تو اسے وہ 'خوب کوستی ہے بددعا دیتی ہے ماں کے غصے کو بیان کرتے ہوئے آغا نے کتنی عمدگی سے اس عہد کی زبان کو پیش کیا ہے جس سے اس عہد کی تصویر نظروں میں گھوم جاتی ہے۔مثلاً ماں کہتی ہے۔

''او ہے موئے ۔اوہ اڑ کے باوا ظلمی کہیں کے ۔جوانا مرگ جائیا۔آئے نا تجھے ڈھائی گھڑی کی۔نامراد۔کیسا میری بچی کو مار گیا۔صدقے میں دوں تجھے اس جگہ پہسے جہاں میری بچی کی دائی نے ہاتھ دھوئے۔ایسی کہا ترے کلیجے میں چٹکی توڑلی۔اندر ذرا آ۔کھا نہ جاؤں تو سہی۔ٹو ٹیں تیرے ہاتھ۔نگوڑا غارتی کہیں کا''۔۴

اس اقتباس میں ہم آغا حیدر کے نسوانی زبان کے لطف سے آشنا ہو سکتے ہیں۔بیگماتی زبان کے کوسے' بددعائیں اور گالیاں سبھی اس میں نظر آتی ہیں ۔ جو دلی کی بیگمات بخوبی استعمال کرتی تھیں ۔ایسے موقعوں پر مخاطب کے لئے ظلمی' غارتی' نگوڑا' وغیرہ القاب استعمال کیے جاتے تھے۔''صدقے میں دو تجھے جہاں میری بچی کی دائی نے ہاتھ دھوئے ۔صدقہ دنیا نیک عمل ہے ۔لیکن یہی محاورہ جب گالی میں بدلتا ہے تو مفہوم بدل جاتا ہے۔

''صدقے میں دینا جہاں بچی کی دائی نے ہاتھ دھویا'' یعنی ایسی جگہ جو نجس ہے ناپاک ہے وہاں صدقہ میں دوں گی مراد ہے۔جس سے خواتین کے غصے کی کیفیت کا علم ہوتا ہے۔آغا نے اس زمانے میں مستعمل اصطلاحوں اور لفظیات کو بڑی عمدگی سے

زبان کی چاشنی کے ذریعہ پیش کر دیا ہے۔آغا حیدر نے بیشتر تحریروں میں نسوانی کرداروں کے ذریعہ ان کی مخصوص لفظیات' مخصوص محاوروں کوسوں اور گالیوں کا استعمال کیا ہے۔ایک اقتباس ملاحظہ ہو جہاں نسوانی زبان سے نکلی گالیاں اور کوسنا مخصوص محاوروں کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔

''قسم ہے مجھے تیں دھار دودھ کی جونواب پر نثار کیں اور طلاق ہے اس بندی کی جنتی پر جو تری پوری طرح کد بدیا نہ بنوائی۔ٹھیر جا بڑی چربیا گئی ہے۔ابھی آن کے آن میں سدھر وائے دیتی ہوں۔میرا بھی فتح النسا نام نہیں۔ اپنے نام کی میں بھی ایک بندہ بشر ہوں کسی مغل کی بہنیں چمہار کی جنی کہیو جو تیرے سارے مغز کی گرمی نہ چھٹوادی۔ وہ رسیوں سے بندھوا سائیسوں سے جوتیاں نہ لگوائی ہوں کہ تو بھی کدھی کو یاد کرے۔لنکا کہیں کی چوٹی جُمع مسجد کی سیڑھیوں پہ کی شُہدن' اردا بیگنی' اوخّو کیا کیا تھرکتی ہے۔کیا کیا کلیں توڑتی ہے۔بوئی بوئی پڑی ناچتی ہے۔خاک پہ بسم اللہ اللہ نے دیکھ کے ہی ٹنچا ہے۔دیکھتی جاوہ چار چوٹ کی مار پٹواؤں کہ بند بند دھیلا ہو جائے کھڑی پڑی کہر وانا چے''۔۵

غرض اس اقتباس میں ہمیں عورتوں کی نوک جھونک او ران کی گالیوں سے واقفیت ہوتی ہے۔اس کے علاوہ عورتیں کس طرح کے محاورے' فقرے جملے اور طعنے کستی ہیں ان کا بھی علم ہوتا ہے۔یہاں چربیانہ بہ مطلب چربی آنا محاورہ ہے اس کے علاوہ گرمی اتارنا' کلیاں توڑنا' بند بند ڈھیلا ہونا اور بوٹی بوٹی پڑنا جیسے بیگماتی محاورے استعمال ہوئے ہیں۔ان محاوروں اور کوسوں سے بیگماتی زبان کی مخصوص لفظیات سے آگہی ہوتی ہے جو ہماری نئی نسل کے لئے بیش قیمتی سرمایہ ہے۔

جہاں آغا حیدر کے یہاں نسوانی' کوسے' طعنے اور بد دعاؤں کا ذکر ملتا ہے۔وہیں انھوں نے دعائیہ فقرے اور جملوں کو بڑی خوبی سے نسوانی لب و لہجے کی چاشنی کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''میری چندا درخشندہ توجیے' راج رجے ۔دنیا کے سکھ چین دیکھے۔کہتی تو ہوگی کہ یہ اللہ ماری بہن منھ دیکھے کی محبت کرنے والی ہے۔آنکھیں ہوئیں چار دل میں آیا پیار اور بہن کی ساری چاہت اوپری پھپھڑ دلا لے ہیں''۔۶

جہاں انہوں نے نسوانی کہاوتیں' محاورے' ضرب الامثال دعائیں' بدعائیں' پہلیاں اور نوک جھونک کا انداز پیش کر کے اپنے اسلوب میں جان ڈالی ہے وہیں انہوں نے عورتوں کی مخصوص اداؤں کی بھی کامیاب تصویر کشی کی ہے کہ سارا نقشہ نظروں میں رقص کرنے لگتا ہے۔اپنے ایک مضمون میں دو خواتین کے آپسی گفتگو کے ذریعہ ان کا نسوانی لب و لہجہ ان کی مخصوص شرم وحیا' ان کے جذبات و احساسات اور مخصوص اداؤں سے بات کرنے کی بڑی عمدگی سے عکاسی کی گئی ہے۔مثال دیکھئے:

''ایک دن تمہارے دولھا بھائی نے مجھ سے کہا کہ بیگم کہو تو ہم مونچھیں رکھ لیں میں نے کہ ہاں کہا رکھ لو۔گھر کی کھیتی ہے نئی چیز کا مان گون

بھی زیادہ ہوتا ہے اس کے بعد مقدمے میں وہ
باہر چلے گئے ۔ کوئی دس بارہ دن کے بعد جو
آئے ۔ تو اے ہی میں دیکھ کے دنگ رہ گئی کہ
ووئی یہ کون مردوا گھسا چلا آتا ہے ۔ اوپر کا ہو
نٹ کچھ عجیب سا موٹا موٹا معلوم ہونے لگا ۔
مجھے مونچھوں کا خیال بھی نہیں رہا تھا کہ اے
ہے شاید کچھ ہو گیا ہے جو رسوت یا جدوار کا
لیپ انہوں نے ہونٹ پر کیا ہے ۔ جب قریب
آئے میں نے سلام کیا غور سے دیکھا تو نگوڑی
نمانی مونچھیں تھیں ۔ میں نے کہا بخدا تمہیں
مونچھیں ایک آن نہیں سجتیں ۔ اللہ ان کو دور کرو
اچھی خاصی بشادی کی صورت بنالی ۔ مسکرائے
اور کہا کہ بیگم تمہاری
خوشی سہی عورت کا سنگار میاں کے لئے اور میاں
کا بناؤ بیوی کے خوش کرنے کو ہوتا ہے کسی اور
سے تکو انا تو مقصود ہی نہیں ہوتا '' ۔ ۷

آغا حیدر نہ صرف عورتوں کی دعائیں، بددعا ئیں، شرم وحیا گفتگو کے انداز اور اداؤں کا ذکر کیا ہے بلکہ ان کی کفایت شعاری اور ہر معاملے میں بچت کرنے کی عادت پر اپنے کر داروں کے ذریعہ پیش کیا ہے ۔ مثلاً مضمون ''نائی کی کرامات'' میں بد رالدین کی بیوی اپنے شوہر سے حجامت کرنے سے روکتے ہوئے کہتی ہے:

''(حقارت آمیز انداز سے) اے اٹھاؤلال پر
دہ، برآمد ہوتے ہیں (حیرت واستعجاب سے)
اے ہے کون ہے؟ کنڈی کن نے کھول لی؟
اوئی یہ کون ؟ اب تک کہاں غارت
تھے؟ صبح کا بھولا شام کو آئے وہ بھولا بھولا نہیں
کہلاتا ۔ اچھی یہ چہرے پے لڑی کن نے کی
؟ گوٹا کناری کنھیا کی مورت اور ڈاڑھی نہ مو
نچھ موئے مخنث کی صورت (نالت ۔ نعلت
۔ لعنت) نالت ہے ۔ خدا کی پھٹکار موا مسخرا
باولا ۔ کیا سانگ بھر کے گھسا ہے ۔ اچھی شہر
میں باجنی باجے گی'' ۔ ۸

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے آغا نے عورتوں کے نازنخرے ان کی اداؤں اور چونچلوں کو بھی مخصوص پیرائے میں بیان کر اپنی مہان دانی کا لوہا منوایا ہے ۔ انہوں نے اس اقتباس میں نسوانی محاوروں کے عمدہ استعمال سے مونچھیں منڈوانے پر گھر کی بڑی عورتوں کیطعنہ دینے کےانداز اورعورتیں کی حقارت کے لئے اے اٹھاؤ اور تعجب کے لئے اے ہے کون، اوئی یہ کون ہے جیسے الفاظ عمدگی سے پیش کیا ہے اسی طرح غصے کے وقت عورتیں موا، مسخرا، باولا، کہاں غارت تھے جیسے جملے یا فقرے استعمال کئیہیں ۔ اس کے علاوہ اس اقتباس میں صبح کا بھولا شام کو گھر آئے تو اسے بھولا نہیں کہتے جیسی مثل کے علاوہ، خدا کی پھٹکار ہونا، سانگ بھرنا، وغیرہ محاوروں کو بھی خواتین کی نسوانی اداؤں کے سلسلے میں پیش کیا ہے ۔

غرض آغا حیدر کے اسلوب کے مطالعہ سے ان کی بیگماتی زبان پر بھر پور قدرت کا اندازہ ہوتا ہے وہ بلا شبہ زبان کے بادشاہ تھے نسوانی زبان کی کہاوتیں، فقرے، طعنے، دعائیں بددعائیں ۔ ضرب الامثال بیگماتی تہذیب، پکواں، زیورات، رسم ورواج، عقائد، لباس کے علاوہ نسوانی ادائیں اور نخرے سب ہی کا لطف آغا حیدر حسن کی زبان

واسلوب سے بخوبی لیا جاسکتا ہے۔

چوں کہ آغا حیدر حسن مرزا اور حاضر جواب بھی تھے جس کی بدولت وہ تمام عناصر ان کی شخصیت کی خوبی بن گئے ۔ان کی تحریروں میں بھی یہی خصوصیت بجا طور پر نظر آنے لگیں۔آغا کی بیگماتی زبان واسلوب کے اثرات کی نشاندہی کرتے ہوئے محی الدین حسن لکھتے ہیں

''انہوں نے بیگماتی زبان کے نمونے پیش کئے کیونکہ ان کی پرورش بھی پنڈت رتن ناتھ سرشار کی طرح زبان خانوں میں ہوئی تھی ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو بیگماتی زبان پر کافی عبور حاصل تھا اور آغا صاحب کی مزاج میں ظرافت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی وہ چاہیں کسی بھی عنوان پر گفتگو کرتے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ منھ سے پھول جھڑ رہے ہیں''۔۹

آغا حیدر کی بیگماتی زبان کے اس جائزے سے ان کی زبان خصوصیات کا بھرپور علم ہوتا ہے۔وہ دلی کی بیگماتی زبان کو برملا و برجستہ طور پر استعمال کرتے تھے۔شگفتگی' تازگی' لطافت' دلکشی' رنگینی و برجستگی کے علاوہ پُر مزاح و دلچسپ محاوروں' فقروں' کہاوتوں اور ضرب الامثال کے علاوہ مختلف نادر تشبیہات' استعاروں و دلچسپ فقروں و جملوں سے اپنے اسلوب کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔

غرض آغا حیدر کی کسی بھی تحریر کا مطالعہ کر لیجیے۔ وہ دلکشی و دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی ۔ وہ تاثراتی و جمالیاتی نقاد ہیں سوائے ان کے تحقیقی مضامین کے ان کی کسی بھی تحریر کو لے لیجئے وہاں ان کی زبان و بیان کی لطافت اور شگفتگی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔

آغا حیدر کا اسلوب منفرد ہے اور وہ انھیں سے منسوب ہے۔انھیں اسلوب کا بادشاہ بے جا نہیں کہا گیا۔زبان و بیان پر مکمل دسترس' مہارت اور اپنے منفرد اسلوب کی بدولت وہ اردو ادب میں ہمیشہ یاد کئے جائیں گے۔

☆☆☆

حوالے

۱۔رشید احمد صدیقی، آشفتہ بیانی میری، ص۷۵

۲۔فاطمہ عالم علی، یاداشت بخیر، ص۱۸۹

۳۔آغا حیدر حسن، دلی کی بیگمات، ندرت زبان، ص۳۳۳

۴۔آغا حیدر حسن، نقش تربیت، پس پردہ، ص۱۵۱

۵۔آغا حیدر حسن، بیگم نائیڈو، پس پردہ، ص۱۹

۶۔آغا حیدر حسن، استانی، پس پردہ، ص۳۳۳

۷۔آغا حیدر حسن، سید حسین، پس پردہ، ص۳۳۳

۸۔آغا حیدر حسن، نائی کی کرامات، پس پردہ۱۸۳

۹۔محی الدین حسن، دلی کی بیگماتی زبان، ص۱۳

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

idarasabras@yahoo.in پر بھیج سکتے ہیں۔

عبد الغفار

مضمون

آغا حیدر حسن اور خطاطی کا فن

''حیدر منزل'' آغا حیدر حسن مرزا سے معنون اور حیدرِ کرّار حضرت علی کرم اللہ وجہ سے ان کی نسبت کی مظہر ہے۔ رہائش گاہ بھی ہے اور دانش گاہ بھی، دارالنوادر اور دارالمعمور اس در سے کئی ارباب علم و فضل فیض یاب ہوئے۔ آغا حیدر حسن مرزا صاحب کی تصنیف دکنی لغت و تذکرہ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت جو پروفیسر مغنی تبسم صاحب مرحوم معتمد عمومی، ادارۂ ادبیات اردو کے سپرد تھی۔ اس ضمن میں برادرم ڈاکٹر جعفر جری جو اس وقت ادارۂ ادبیات اردو میں قومی اردو کونسل کے تعاون سے چلنے والے شعبہ کمپیوٹر کے سوپروائزر تھے۔ راقم شعبہ خطاطی کے استاذ و سنٹر انچارج کی حیثیت سے اُج بھی خدمات انجام دے رہا ہے۔ ہم دونوں کا دکنی لغت و تذکرہ مخطوطات کی ترتیب و اشاعت کے سلسلے میں معتمد عمومی کی ہدایت پر اکثر حیدر منزل بنجارہ ہلز آنا جانا ہوتا جب بھی ان دونوں معزز شخصیات نواب میر معظم حسین صاحب مرحوم اور ان کی اہلیہ محترمہ بیگم مہر النسا صاحبہ سے ملاقات کا شرف حاصل ہوتا تو دلی مسرت ہوتی یہ دو مشفق و مہربان چھوٹوں سے شفقت سے پیش آتے کام دینے اور لینے کے دوران باتوں ہی باتوں میں ہمیں نصیحت و رہنمائی کرتے اور حیدرآباد کی تاریخ سے متعلق واقعات بھی سناتے جو آج بھی مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ نواب صاحب کا تاریخ دکن پر ان کے دکنی تاریخ کے انسائکلو پیڈیا ہونے کی دلالت کرتا دوران گفتگو راقم اکثر آغا حیدر حسین صاحب کے بارے میں سنتا تو دل میں یہ خواہش پیدا ہوتی کہ کاش میں ان سے ملا ہوتا؟

میرا تجسس اس وقت مزید بڑھا جب محترمہ فاطمہ عالم علی صاحبہ نے اپنی کتاب ''یادش بخیر'' میں آغا حیدر حسین مرزا کے بارے میں دل پذیر انداز میں مضمون تحریر کیا اور اس کتاب کی اشاعت کا کام میرے ذمہ کیا تھا۔ وہ ایک اچھی ادیب اور بہترین استاد ہیں۔ اس طرح دوبارہ آغا صاحب کو پڑھنے کا موقع دستیاب ہوا۔ آغا صاحب کے نواسے ڈاکٹر میر اصغر حسین سابق ڈائرکٹر UNESCO فرانس سے مجھے تقریباً 25 برس سے شفقت و رہنمائی حاصل رہی ہے۔ وہ اپنے والدین گرامی کی طرح ہی بڑے مشفقانہ انداز میں مجھ سے ملتے ہیں جب بھی حیدر منزل میرا جانا ہوتا اکثر ڈاکٹر صاحب ''آغا حیدر کلچرل سنٹر'' میں موجود نوادرات کا مشاہدہ کراتے ہوئے ان کی تفصیلات بھی بتاتے۔ بالخصوص کاغذ اور کے مخطوطات، ممتاز خطاطوں کی قلمی مصوری وصیلوں کے شہہ پارے بیدری، چینی، نقروی ظروف کی تفصیلات سے واقف کراتے نوادرات کے اس عظیم الشان دفتر کے لیے راقم نے معظم حسین صاحب کی ایما پر خط کوفی ہیں ''آغا حیدر حسن کلچرل سنٹر'' کی مہر بھی تحریر کی۔ جس کو موصوف نے نمایاں مقام پر آویزاں کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف 8 دن قبل ہی مجھے آغا حیدر حسن مرزا پر مضمون لکھنے کی خواہش کی عموماً میں مضامین نہیں لکھتا کیوں کہ فن خطاطی جو ایک عظیم ترین فن ہے اس کی مشق اور طلبہ خطاطی کی رہنمائی و تدریسی مصروفیت دوسرے کام کے لیے وقت ہی نہیں دیتی۔ چوں کہ ڈاکٹر صاحب کی خواہش تھی اور آغا صاحب کی شخصیت نے مجھے اس پر آمادہ کر دیا کہ میں اپنے خیالات قلمبند کر سکوں۔

آغا حیدر حسن کا حسب اور نسب ایک طرف خاندان

مغلیہ سے ہے تو دوسری طرف کشمیر کے مہاراجاوں کے باافتخار شاہی گھرانوں سے ہیں وہ 14/اگست 1892ء کو آغا صفدر حسن مرزا کی زوجہ محترمہ بدرالنساء کے بطن سے دہلی کے محل سرائے نواب میں تولد ہوئے۔ ''ماں کی گود بچے کی پہلی درس گاہ ہوتی ہے'' کے مصداق گھر میں ابتدائی تعلیم کا آغاز بیگماتی زبان (ریختی) میں ہوا۔ دہلی سے فوقانی تعلیم کی تکمیل کے بعد اعلی تعلیم کے لیے علی گڑھ میں سرسید کے محمڈن کالج سے رجوع ہوئے جو بعد میں مسلم یونیورسٹی بنا۔ اس طرح 6 سال کی تعلیم کے دوران ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب، منظور حسین صاحب، اور امتیاز حسین صاحب جیسے جلیل القدر و قابل ترین اساتذہ کی سرپرستی و رہنمائی میں آغا صاحب کی نشو ونما ہوئی۔ ساتھ ہی ساتھ رشید احمد صدیقی صاحب جیسے ادیب سے بھی مراسیم استوار ہوئے جس کے نتیجے میں آغا حیدر حسن مرزا نے مضامین لکھنے کی شروعات کی یہ مضامین ''پس پردہ'' کے عنوان سے شائع ہو چکے۔ یوں ان کی ادبی و علمی کارناموں کی زندگی کا آغاز ہوا۔

گاندھی جی کی تحریک عدم تشدد میں شرکت کے باعث انھیں اور ان کے ساتھیوں کو یونیورسٹی نے بغیر ڈگری دیئے نکال دیا اور انہوں نے ملاقات کی تلاش میں حیدرآباد دکن کا رخ کیا۔ پہلے پہل محکمہ پولیس میں ملازمت کی چوں کہ یہ شریف النفس شخصیت کے مالک تھے اس ملازمت سے مانوس نہیں ہوئے۔ ادبی خدمت کا جذبہ ان کی رگ رگ میں بسا ہوا تھا چناں چہ شعبہ تعلیم میں ملازمت کی تلاش جاری رکھی۔ کچھ عرصہ کی جدو جہد کے بعد نظام کالج میں بہ حیثیت معلم اردو وابستہ ہوئے اور درس و تدریس اور ادبی خدمات کا آغاز کیا۔ اپنی محنت لگن و جستجو سے پروفیسر کے جلیل القدر عہدہ تک رسائی حاصل کرتے ہوئے عالمی شہرت یافتہ دانشوروں کی فہرست میں اپنا توازن قایم کیا۔ زمانے کے Challenges کو انھوں نے قبول کرتے ہوئے ترقی کی راہ پر گامزن رہے۔

اسلام نے تعلیم، تحقیق اور متاع لوح و قلم کی بڑی اہمیت واضح کی ہے۔ معلم جن وانس علیہ الصلوۃ اسلام نے علم کو فرضیت اور عبادت کا درجہ دیتے وئے تشنگان علم کو علم کی برکتیں اور بشارتیں بتائی ہیں۔ قرآنی تعلیمات علوم وفنون کا ذخیرہ ہیں۔ رب العالمین نے مغلوں کو بھی بے پناہ صلاحیتوں کا مالک بنایا تھا۔ جنھوں نے ہندوستان میں 331 سال حکمرانی کی ان کے عہد میں فن تعمیر گھڑ سواری، مصوری، موسیقی، اور خطاطی کو جو زبردست فروغ ملا جس کی نظیر نہیں ملتی۔ مغلیہ سلطنت کے بانی بابر خود ایک اچھے خطاط تھے انھوں نے خط بابری وضع کیا۔ اپنے ہاتھ سے ایک قرآن شریف تحریر کر کے بیت اللہ مکہ مکرمہ روانہ کی۔ مغلوں کے یہاں کئی خطاط تھے ان میں سے مشہور خطاط عبدالحق بن قاسم شیرازی بھی تھے جنھیں دربار شاہ جہاں سے امانت خاں کا خطاب بھی دیا گیا مغلوں کے دور کے شہہ پاروں کو دیکھ کر ہم اندازہ لگا سکتے ہیں کہ امانت خاں شیرازی جو خط ثلث لکھنے میں ماہر تھا اور اس نے اکبر کے روضہ کے تمام کتبات لکھے تھے۔ اور جب آگرہ تاج محل کی عمارت کی تعمیر شاہ جہاں نے کی تو اس وقت تمام کتبات اسی نے خط ثلث میں لکھے تھے۔ ان کے یہاں فن اور فن کار لازم وملزوم کی حیثیت رکھتے اس طرح شہنشاہ ہند بابر سے لے کر آخری شہنشاہ بہادر شاہ ظفر تک تہذیب وفن کا تحفظ برقرار رہا۔

مغلیہ خانہ اس کے چشم و چراغ آغا حیدر حسن مرزا میں بھی سامان آرائش وفن کاروں کے شہہ پارے کو اکٹھا کرنے کا شوق تھا۔ وہ نوادرات کے ان شہ پاروں کو سلیقہ بخشنے کے فن سے بہ خوبی واقف تھے اس لیے کہ وہ بھی تو اسی نسل کی آخری پیداوار تھے۔ ''مخزونہ آغا حیدر حسن''

آغا حیدر حسن کلچرل سنٹر کے نام سے ان کی صاحب زادی مہر النسا اور داماد میر معظم حسین صاحب مرحوم نے قایم کیا ہے۔ معظم حسین صاحب کے انتقال کے بعد ان کی اہلیہ محترمہ مہر النسا صاحبہ اس مخزونہ کی آرائش و زیبائش میں منہمک ہیں۔ اس کلچرل سنٹر کے خزانے میں آغا صاحب کے ملبوسات، کتابیں ان کی بنائی ہوئی تسبیحات ظروف مسند کے علاوہ ان کے جمع کردہ نادر و نایاب نوادرات، مخطوطات، تاڑ پتر کے علاوہ خطاطی کے بیش بہا قیمتی شہہ پارے جو مختلف ماہرین فن کے تیار کردہ یہاں محفوظ ہیں جو مختلف خطوط جیسے خط ثلث، خط تسبیح، خط نستعلیق میں خط غبار، خط ابری، خط گلزار، خط شکستہ وغیرہ کا احاطہ کرتی ہیں۔ ممتاز اساتذہ کی وہ وصلیاں مشق بیاضی کے اوراق جو طلبہ خطاطی کو خط نستعلیق کی تعلیم و تربیت کی غرض سے تیار کی گئی ہیں حروف تہجی دو حرفی جوڑ دوائر، کشش اور فن کے دیگر رموز سے واقف کراتی ہیں اس کلچرل سنٹر کے ذخیرہ میں قلمی قرآن کریم کے نسخے بھی قابل دید ہیں۔ ان کی اعلیٰ درجہ خط تسبیح میں کتابت اور طلائی ونقروی کام ناظرین کو تسخیر کر دیتا ہے۔ Epigraphs میں گچی کی اینٹ پر تحریر کردہ ایک فن کا شاہ کار کلچرل سنٹر کی زینت کو دوبالا کرتا ہے۔ غالب کا لباس غالب اکیڈیمی کو دے کر ان کی مہر انگشتری کو یہاں محفوظ کر لیا گیا ہے۔ مہاراجہ سرکشن پرشاد شاد، مدار المہام، ریاست حیدرآباد دکن کے جو خود بھی ایک اچھے خطاط وخوش نویس تھے اور آغا صاحب کے ان سے اچھے مراسم بھی تھے کے تیار کردہ فن خطاطی کے شہہ پارے اردو و فارسی زبان سے ان کی دلچسپی کے مظہر ہیں۔ مستقبل کے تشنگان علم وفن کے لیے یہ کلچرل سنٹر بہت بڑی نعمت ثابت ہوگا۔

یوں میرا حاصل مطالعہ یہ رہا کہ میں نے آغا حسن مرزا صاحب کے علاوہ جتنے بھی دانشوران علم وفن کو پڑھا اور ان جیسی مشہور شخصیات کی خدمت سے استفادہ کرنے کا موقع ملا اس سے یہ عیاں ہوتا ہے کہ کہیں نہ کہیں ان دانشوروں کا تعلق لوح وقلم سے ضرور رہا ہے۔ وہ فن خطاطی وخوش نویسی کے ماہر تھے یا پھر اس کے دل دادہ ضرور تھے۔ کیوں کہ یہ فن نبیوں سے لے کر صحابہ کرام اور پھر بادشاہوں سے لے کر امراء اور عام آدمی تک لوح وقلم کی باریکیو سے واقف کرتا ہے۔ اسی لیے دانشوران علم وفن تمام کے تمام اس کے زیور فن سے آراستہ ہوتے میری نظر میں یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ جو پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا صاحب مرحوم میں بھی یہ وصف درجہ اتم پایا جاتا تھا۔

ساہتیہ اکادمی

کے زیر اہتمام
ہندوستانی ادب کے معمار
کے سلسلے کی ایک کڑی

شاذ تمکنت

بیگ احساس

قیمت: 40 روپے
ملنے کا پتہ: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ،
نئی دہلی 001 110
سیلس آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 001 110

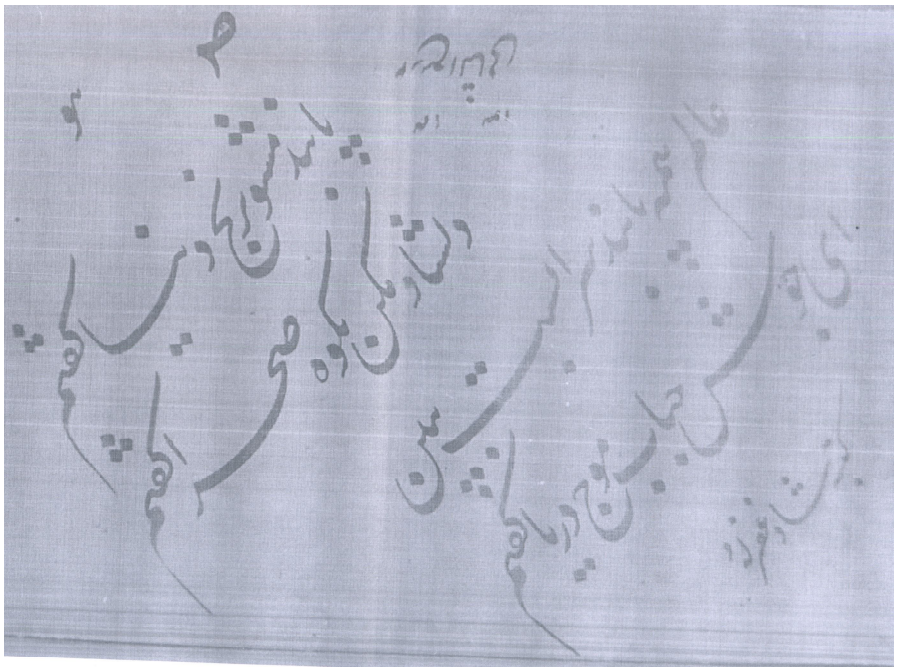

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا کی خطاطی کے نمونے

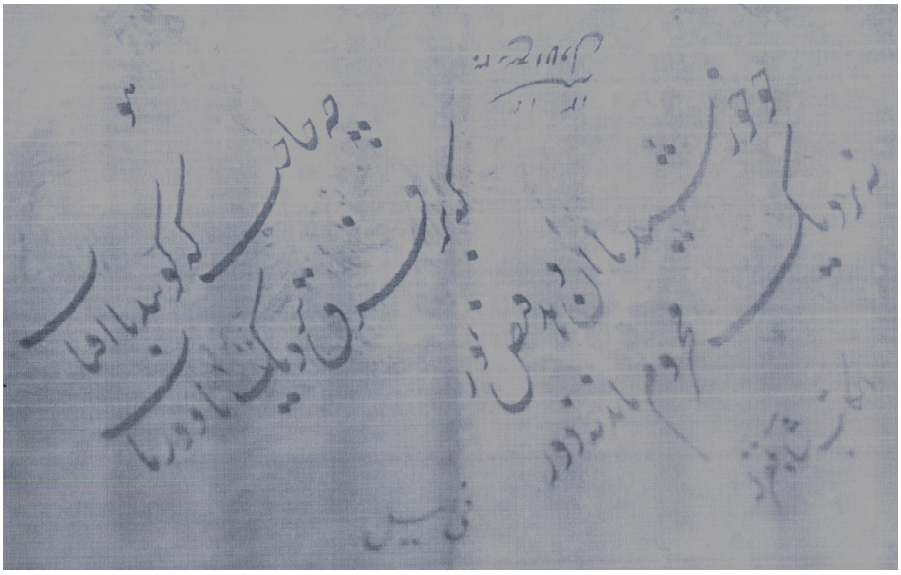

پریس ریلیز

ساھتیه اکادمی ایوارڈ اور ترجمه ایوارڈ 2017 کا اعلان

اردو میں اکادمی ایوارڈ بیگ احساس اور ترجمہ ایوارڈ محمود احمد سحر کو

اردو کے ممتاز افسانہ نگار اور ادیب پروفیسر بیگ احساس کو ان کے افسانوی مجموعہ 'دخمہ' پر ساہتیہ اکادمی ایوارڈ 2017 دینے کا اعلان کیا گیا ہے۔ اکادمی کے صدر پروفیسر وشوناتھ پرساد تیواری کی صدارت میں ہوئی ایکزیکٹیو بورڈ کی میٹنگ کے دوران ہندوستان کی 24 زبانوں کے ادیب و شاعر کو ان کی تصنیفات پر ایوارڈ دیے جانے کے فیصلے کو منظوری دی گئی۔ اس کے بعد ایک پریس کانفرنس کے دوران سکریٹری، ساہتیہ اکادمی ڈاکٹر کے سری نواس راؤ نے سبھی زبانوں کے انعامات کا اعلان کیا۔ اردو میں یہ ایوارڈ پروفیسر بیگ احساس کو دیا جائے گا۔ اردو کے جدید افسانہ نگاروں میں پروفیسر بیگ احساس ایک نمایاں نام ہے۔ فن افسانہ نگاری پر ان کی گرفت کافی مضبوط ہے۔ افسانوی مجموعہ 'دخمہ' سے قبل ان کی کئی کتابیں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ پروفیسر بیگ احساس تقریباً چالیس برسوں تک درس و تدریس کے پیشے سے وابستہ رہے ہیں۔ انھوں نے 35 برسوں تک سنٹرل یونیورسٹی آف حیدرآباد میں اردو کے استاد کی حیثیت سے اور بعد میں صدر شعبہ کی حیثیت سے اپنی خدمات انجام دیے۔ علاوہ ازیں وہ چار برسوں تک عثمانیہ یونیورسٹی میں شعبۂ اردو کے سربراہ بھی رہے۔ آج کل اردو کے ادبی رسالہ 'سب رس' کے ایڈیٹر ہیں۔ گزشتہ دنوں جیوری کی میٹنگ کے دوران ان کے نام کا فیصلہ اتفاق رائے سے کیا گیا جس کی صدارت اردو مشاورتی بورڈ کے کنوینر اور معروف شاعر چندر بھان خیال نے کی اور جیوری ممبران میں نند کشور وکرم، سلام بن رزاق اور پروفیسر اشرف رفیع شامل تھے۔ ایوارڈ کے لیے 1 جنوری 2011 سے 31 دسمبر 2015 تک کی مطبوعات زیر غور آئیں۔ دیگر ایوارڈ یافتگان میں بنگالی کے افسر احمد، ڈوگری کے شیو مہتا، انگریزی کے مما نگ دئی، ہندی کے رمیش کنتل میگھ، کشمیری کے اوتار کرشن رہبر، راجستھانی کے نیرج دیّا، پنجابی کے پخھتر، سنسکرت کے نرنجن مشرا کے نام شامل ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ساہتیہ اکادمی ترجمہ ایوارڈ 2017 کا بھی اعلان کیا گیا۔ اردو کے لیے محمود احمد سحر کو 'کالیداس کی عظیم شاعری میگھ دوت' کے منظوم ترجمے کے لیے یہ انعام دینے کا فیصلہ کیا گیا۔ اُجین، مدھیہ پردیش کے رہنے والے 80 سالہ کہنہ مشق ادیب و شاعر اور مترجم محمود احمد سحر نے 'میگھ دوت' کے علاوہ کالیداس کی تصنیفات 'رِتو سمہار'، 'کمار سمبھو' کا بھی منظوم ترجمہ کیا ہے۔ انھوں نے بھرتری ہری کی سنسکرت شاعری 'سنگار شتک' کا بھی سنسکرت سے براہِ راست اردو منظوم ترجمہ کیا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق ناول نگار بھی ہیں۔ جناب چندر بھان خیال کی صدارت میں ہوئی جیوری کی میٹنگ میں اتفاقِ رائے سے ان کے نام کا فیصلہ ہوا۔ جیوری ممبران میں پروفیسر ابن کنول، پروفیسر صاحب علی اور عزیز اللہ بیگ کے نام شامل ہیں۔ دیگر 23 زبانوں میں ڈوگری کے لیش رینا، انگریزی کے رنجیتا وشواس، گجراتی کے ہریش مینا شرو، ہندی کے پرتبھا اگروال، کشمیری کے اقبال نازکی، میتھلی کے اندر کانت جھا، راجستھانی کے کرشنا جاکھڑ، پنجابی کے جندر اور سنسکرت کے پروین پانڈیا کو ترجمہ ایوارڈ سے سرفراز کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ ترجمہ ایوارڈ کے لیے 1 جنوری 2011 سے 31 دسمبر 2015 تک کی مطبوعات زیر غور آئیں۔

ساہتیہ اکادمی ایوارڈ ایک لاکھ روپے اور امتیازی نشان جبکہ ترجمہ ایوارڈ 50 ہزار روپے اور امتیازی نشان پر مشتمل ہے۔ ساہتیہ اکادمی انعام 12 فروری کو نئی دہلی میں منعقدہ ایک تقریب میں دیا جائے گا جبکہ ترجمہ ایوارڈ کے لیے تاریخ کا اعلان بعد میں کیا جائے گا۔

پروفیسر آغا حیدر حسن مرزا

Regd No. H-HD 970-2015-2017 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-01 January, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Taanaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469